Scanned by CamScanner

فنکارانِ بہار

جلد اوّل

(مقالوں کا مجموعہ)

پروفیسر ظفر حبیب

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکیڈمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔

اس کے مشمولات کی ذمہ داری مصنف پر ہے۔

FANKARAN-E-BIHAR (Vol. 1)

by: **Prof. Zafar Habib**

Edited by: **Dr. Khalid Mahmood**

Year of Edition 2016 ISBN 978-93-5073-869-6

₹ 200/-

نام کتاب : فنکارانِ بہار (جلداوّل) مصنف : پروفیسر ظفر حبیب

مرتب : ڈاکٹر خالد محمود

موبائل : 09835843590 ای میل : zafarh1947@gmail.com

سنِ اشاعت : ۲۰۱۶ء قیمت : ۲۰۰ روپے

تعداد اشاعت : ۵۰۰ (پانچ سو)

کمپوزنگ : افضل، نایاب گرافکس، دربھنگہ۔9905228544

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

زیرِ اہتمام : وسیم احمد فہمی

تقسیم کار : اشرف پبلی کیشنز، بیت الشرف، عبدالحسیب کالونی، لکھمنیاں (بیگوسرائے) بہار 851211

ملنے کے پتے

☆ قاضی پبلیشرس، نئی دہلی ☆ ناولٹی بکس، قلعہ گھاٹ چوک، دربھنگہ ☆ کتابستان، کچہری چوک، بیگوسرائے ☆ مرکزی مکتبہ اسلامی، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

اساتذہ کرام

ڈاکٹر اختؔر قادری رحمہ اللہ

اور

ڈاکٹر وہاب اشرفی غفرلہٗ

کے نام

اور

ان ناقدین کے نام

جن کا مسلک

''من ترا حاجی بگویم''

تھا اور ہے

مشمولات

☆☆

مرتب کردہ

جناب ظفر حبیب صاحب کے مقالوں کا یہ تیسرا مجموعہ آپ کی خدمت میں حاضر کر رہا ہوں اس کی ترتیب کا شرف مجھ کو حاصل ہوا یہ میرے لئے مسرت اور طمانیت کا سبب بنا۔۔۔

یہ ظفر حبیب صاحب کی تنقیدی نگارشات کا تیسرا مجموعہ ہے لیکن یہ مجموعہ ان کے طویل منصوبہ کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس سریز میں ظفر حبیب صاحب نے لائقِ افتخار اور پردہ خفا میں پڑے ہوئے دانشور قلمکاروں کو جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح صوبہ بہار سے ہے روشناسِ خلق کرانے کا عزم کر رکھا ہے۔

توقع ہے کہ دانشورانِ زبان وادب اور تمام اردو دان خواہ طلبہ وطالبات اس کتاب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ میں شکر گزار ہوں اپنے بڑے بھائی وسیم احمد فہمی کا جنہوں نے طباعت کے تمام مراحل کی ذمہ داری اپنے سر قبول کر لی۔ اللہ ان کی رفاقت اور تعاون کو تادیر برقرار رکھے آمین۔

اُمید ہے کہ طلبہ کے علاوہ عام قارئین بھی اس نئی تصنیف کا پُر جوش استقبال کریں گے۔

یہ کتاب بہار اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے اشاعت کے مراحل طے کر سکی ہے اس تعاون کے لئے ہم اکیڈمی کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد خالد محمود

فروری ۲۰۱۶ء

وجہِ تحریر

آج سے تقریباً ۴۵ رسال قبل راقم الحروف نے اپنی علمی زندگی کا ایک ہدف مقرر کیا تھا اور ایک تصوراتی خاکہ بطورِ خود مرتب کرلیا تھا۔ ابتدائی مطالعہ کے دوران ہی یہ اندازہ ہوا کہ اہلِ دنیا انصاف پر قائم نہیں ہیں۔ حالانکہ خالقِ کائنات نے کہا ہے لقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم۔ لاریب یہ حق ہے کہ ہمارے رب نے ہر کسی کی تخلیق احسنِ تقویم پر کی ہے۔ یہ دنیا ایسے اشخاص وافراد سے بھری ہے کہ جس کی تخلیق نک سک سے درست ہے۔ اس کے باوجود اصحابِ دنیا کا رویہ غیر عادلانہ اور بسا اوقات انتہائی منفیانہ تھا بھی اور ہے بھی۔ علم وادب کے تناظر میں اس کی جلوہ نمائیاں جا بجا ہی نہیں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ علاقائی عصبیت نے اچھے اچھوں کا قلع قمع کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھا۔ اس احساس نے صوبہ بہار اور اس کے دیار وامصار پر مجھ کو متوجہ کرایا۔ یہاں سے وہاں تک از اول تا دمِ تحریر مجھ کو یہی دکھایا کہ حق بہ حقدار رسید نہیں ہوسکا۔ اس جذبہ کے تحت میں نے مقالہ نویسی کے لئے جب پہلا قدم اٹھایا تو وہیں سے واقیم الوزن بالقسط ولا تخسروالمیزان (میزان قائم کرو عدل وقسط کے ساتھ اور ڈنڈی ماری نہ کرو۔ نفسِ آیت)۔ کا رویہ اختیار کیا۔ میں نے خود بھی اسی احساس کے تحت لکھا اور اپنے، اپنوں سے بھی لکھوایا۔ کئی زیرِ نگراں ریسرچ اسکالرس کی کئی تصانیف اس کی گواہی میں پیش کی جاسکتی ہیں (مبارک مونگیری: حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر محمد شرف الدین، فریاد باروی: حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر شبیر احمد، مرحوم شعرائے بیگوسرائے۔ ڈاکٹر فاروق الزماں کے علاوہ غیر مطبوعہ اور زیرِ طبع تصانیف آتش لکھمیاوی: حیات اور شاعری۔ ڈاکٹر نگہت پروین، رفیع الدین راز: حیات اور شاعری۔ فرحت جہاں، اور فریاد باروی بہ حیثیت گیت کار۔ فضیل

احمد وغیرہ)۔ ان میں سے کئی کا شیوع ہو چکا ہے اور کئی اس مرحلہ سے گذر رہی ہیں۔

پیشِ نظر تصنیف ''فنکارانِ بہار'' بھی اسی کوشش کا ایک حصہ ہے۔ یہ جلد اول ہے۔ جلد دوم بھی منظر عام پر آنے کو بیتاب ہے اور جلد سوم بھی زیرِ ترتیب ہے۔ اس میں شامل شعراء وادباء کا تعلق صوبۂ بہار سے ہے۔ اس کا آغاز مولانا ابوالکلام آزاد سے اس لئے ہے کہ مولانا لمبی مدت تک رانچی (بہار) جیل میں قیام پذیر رہے۔ اس طرح میں بہار کو ان کا وطنِ ثانی تسلیم کرتا ہوں۔

فنکاران کے لفظ سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ تمام فنونِ لطیفہ کے ماہرین اس میں شامل کئے گئے ہیں لیکن میں نے اس میں صرف اردو کے ان قلم کاروں کو شامل کیا ہے جن کی خدمات وقیع ہونے کے باوجود لائقِ اعتناء نہیں سمجھی گئیں یا ان پر توجہ دی بھی گئی تو انصاف نہیں کیا گیا۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ آنے والے وقت کا مؤرخ اسے نظر انداز کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کا قلم کار تمام باتیں دوسروں کی لکھتا ہے لیکن شاہ سرخی کے پاس صرف اپنا نام لکھ دیتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ مستقبل کا مؤرخ بھی ایسا ہی کرے۔ راقم الحروف کو اس کی پرواہ نہیں۔ ع اپنا تو کام یہ کہ جلاتے رہیں چراغ

یہ کتاب بہار اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ میں حد درجہ ممنون ہوں کہ مذکورہ اکیڈمی نے میری تصانیف کو منظرِ عام پر لانے میں ہمیشہ میری دستگیری کی ہے۔ ۱۹۸۱ء سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ خدا کرے میں جب تک زندہ رہوں اکیڈمی کی نگاہِ کرم سے محروم نہ رہوں۔

بار بار کی کوششوں کے باوجود کچھ نہ کچھ غلطیاں بار پا جاتی ہیں جسے میں اختیار سے باہر سمجھتا ہوں۔ عزیزی افضل سمیلوی داد وستائش کے مستحق ہیں کہ اپنی پوری توجہ اور تن دہی کے ساتھ ترتیب وتزئین کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔ دعا گو ہوں کہ ربِ کریم ان کی سعادت مندیاں برقرار رکھے اور اچھا سے اچھا کام کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔

ظفر حبیب ۔ ۲۱/ اکتوبر ۲۰۱۵ء

مولانا ابوالکلام آزاد

منفرد مکتوب نگار

مولانا ابوالکلام آزادؔ صرف اپنے دور ہی میں نہیں بلکہ اردو دنیا میں ایکؔ عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک غیر معمولی سیاستداں، ایک بیباک مصنف ایک لاجواب مفسر قرآن، ایک بے مثال انشاء پرداز اور ایک بے نظیر خطیب و مقرر تھے۔ ان کی ان گونا گوں خوبیوں کا ایک نشست میں احاطۂ تحریر میں لانا ایک سخت مشکل کام ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول:

> ''ان کی تحریریں سلگتی ہوئی آگ، بھڑکتا ہوا شعلہ، امنڈتا ہوا سیلاب، پھسلتا ہوا طوفان، گرجتی ہوئی رعد اور چمکتی ہوئی بجلی معلوم ہوتی ہے۔''

نثر میں مولانا موصوفؔ کی کئی تصانیف منظر عام پر آئیں۔ مثلاً ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے مختلف مضامین، تذکرہ، ترجمان القرآن، معارف النفہات، جامع الشواہد، کاروان ضیا، نقش آزاد اور غبار خاطر وغیرہ، ان تمام تصانیف کے مابین ایک ایک وقفہ ہے اور ان کے موضوعات بھی ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔

فی الوقت میرے پیش نظر ان کی مشہور تصنیف ''غبار خاطر'' ہے۔ جو ان کے مکتوب کا مجموعہ ہے اور جس پر ہر زمانہ کے ادیبوں اور تنقید نگاروں نے خوب جم کر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ موضوع آج بھی زندہ ہے۔ اس کے اندر زندہ رہنے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس لئے آئندہ بھی یہ موضوع لائق مطالعہ اور قابل توجہ بنا رہے گا۔

میرا یہ مطالعہ بھی اسی بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ مولانا کی تصانیف میں اس

کتاب کی ایک الگ اہمیت ہے۔"تذکرہ" اور "ترجمان القرآن" کی اشاعت کے لگ بھگ پچیس برس بعد "غبار خاطر" اور "کاروان حجاز" منظر عام پر آیا۔ گمان یہ ہو چلا تھا کہ مولانا کی طویل اور طوفان خیز سیاسی زندگی کی ہنگامہ آرائیوں نے مولانا کے طرز نگارش پر نہ جانے غبار کی کتنی تہہ جمادی ہوگی۔ لیکن قاضی عبدالغفار کے بقول:

> "غبار خاطر" کے چند صفحات پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس ساز کے تاروں کو لوگ سمجھتے تھے کہ ٹوٹ گئے ہوں گے۔ ان کے آہنگ تو کچھ اور دلنواز ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر زندگی اسی طرح بولتی پائی جاتی ہے اور وجدان لطیف اسی طرح کارفرما نظر آتا ہے جس طرح پچیس سال پہلے وہ قلم کو نغمہ اور کاغذ کو رنگ عطا کرتے تھے۔"

غبار خاطر کے متعلق یہ کشمکش جاری ہے کہ یہ کتاب انشائیہ نگاری کی ایک نمائندہ مثال ہے یا مکتوب نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس موضوع پر پرانے اور نئے تنقید نگاروں نے اپنے اپنے دلائل پیش کئے ہیں اور دونوں قسم کے لوگوں نے اپنی اپنی بات کو مبرہن کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملک زادہ منظور احمد کا خیال ہے کہ:

> "صدیق مکرم کا لفظ ہر مضمون کے شروع میں جوڑ دینے سے کوئی مضمون خط نہیں بن سکتا اور نہ یہ القاب نکال لینے سے کوئی خط مضمون بن جاتا ہے۔ یہ خود کلامی ہے اور ان کے اندر وہ عناصر نظر آتے ہیں جو انشائیوں کی جان ہوتے ہیں۔"

سید احمد شمیم کے بقول:

> "غبار خاطر کو مکاتیب کا مجموعہ کہا گیا ہے۔ مگر یہاں مکتوب محض وسیلہ ہے۔ دراصل یہ مکاتیب نہیں ذاتی نوعیت کے اردو میں منفرد انشائیے ہیں۔ جس میں مذہب، فلسفہ، اخلاق، سائنس، تہذیب، تاریخ، شاعری، موسیقی، حسن، عشق اور تصوف کے اسرار و رموز سے پردے

اٹھائے گئے ہیں۔ انہیں پڑھ کر مولانا کی عظمت اور انفرادیت کے مختلف گوشے روشن ہو جاتے ہیں''۔

حامدی کاشمیری نے اس مسئلہ پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور غبار خاطر کو مجموعہ مکتوب ماننے سے انکار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''غبار خاطر کے مکتوبات، مکتوبات سے زیادہ انشائیہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے حال اسیری میں قلم ہاتھ میں لے کر اپنے حافظہ میں محفوظ واقعات اور مشاہدات کو سپرد قرطاس کیا ہے اور ساتھ ہی اپنی علمیت، عقائد، افکار اور نظریات کا اظہار بھی کیا ہے۔''

اس خیال کی تائید میں موصوف نے جو دلیل پیش کی ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

''ان خطوط کو مکتوبات سے موسوم کرنے اور ان میں مکتوب نگاری کے بعض لوازم کی پابندی کے باوجود مکتوب نگاری کی صنف کی حیثیت سے ان کی قدر سنجی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگی۔ عالمی ادب میں مکتوب نویسی ایک منفرد ادبی صنف کے طور پر متعارف ہوئی ہے۔ اردو میں غالبؔ کے خطوط ادبی روایت کا درجہ رکھتے ہیں، غالبؔ کے بعد اقبالؔ، فیضؔ اور سجاد ظہیرؔ سے لے کر تنہاؔ انصاری تک جن جن حضرات نے خطوط لکھے ہیں وہ کم و بیش اسی روایت کی توسیع کرتے ہیں۔ اس روایت کی رو سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ میں ایک ذہنی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ذہنی خلوت کا عالم ہے۔ جس میں کسی تبصرے کا گذر نہیں ہوتا، مکتوب نگار انتہائی بے تکلفی، برجستگی، بذلہ سنجی اور اپنائیت سے مخاطب ہوتا ہے اور بے ساختہ پن سے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ خط کی ابتداء سے تا آخر یہ رشتۂ مخاطبت قائم رہتا

ہے اور مکتوب نگار اپنے معتقدات اور نظریات یہاں تک کہ تعصبات اور ترجیحات کا بھی بے محابہ اظہار کرتا ہے۔ مکتوب نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سنجیدہ، علمی اور فلسفیانہ افکار و نکات بھی سادگی، اختصار اور بے تکلفی سے بیان کئے جاتے ہیں اور کہیں سے کہیں تک مراسلہ، مضمون یا مقالے کی گراں باری کا احساس نہیں دلاتا۔ غبار خاطر کے مکتوبات پر نظر ڈالئے تو یہ تاثر قائم ہونے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ مکتوبات مکتوب نگاری کے ذیل میں نہیں آتے۔''

یہ ساری دلیلیں اپنی جگہ، لیکن دو بنیادی نکات کو سامنے رکھئے تو یہ ساری دلیل بے وزن نظر آئے گی۔ پہلی بات تو یہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ انشائیہ جسے Ligt Essays یا ذہنی ترنگ Loose sally of mind کہا جاتا ہے ابوالکلام کے بعد کی دریافت ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ لفظ انشائیہ کا استعمال اردو زبان میں سب سے پہلے ایک مخصوص صنف ادب کے لئے ڈاکٹر اختر اورینوی نے کیا تھا اور اس صنف پر اردو میں سب سے پہلے باضابطہ کتاب سید محمد حسنین کی ''صنف انشائیہ اور چند انشائیے'' ہیں جس میں اس صنف ادب کے خدوخال پیش کئے گئے اور اردو کی مختلف تحریروں کو ''صنف انشائیہ'' کی صف میں شامل کیا گیا۔ محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال'' سے احمد جمال پاشا کے مضامین تک کو اس میں انشائیہ تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن ''غبار خاطر'' کو اس سے الگ رکھا گیا۔ یعنی اس کو نہ انشائیہ نگاری سمجھا گیا اور نہ خود مولانا موصوف کے پاس اس کا کوئی تصور موجود تھا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ خود مولانا آزاد نے اپنی اس کتاب کو مکتوب کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے غبار خاطر کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

''یہ تمام مکاتیب نج کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کئے جائیں گے.... جس حالت میں قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے اسی حالت میں طباعت کے لئے دیئے گئے ہیں۔''

سیاسی موضوعات پر جو مضامین لکھے گئے ہیں کیا وہ اسی طرح خشک ہیں جیسی خشکی کا تقاضہ اس کے موضوعات کرتے ہیں؟ ترجمان القرآن کی زبان دیکھئے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر لکھتے ہوئے مولانا نے محبت کے موضوع پر جو انشاء پردازی کا جوہر دکھایا ہے کیا تفسیر کی زبان اس انشاء پردازی کی متحمل ہوسکتی ہے؟ ظاہری بات ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہونا چاہئے۔ اس لئے لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دراصل مولانا کے قلم کی یہ فطرت تھی جو لطافتوں کو ساتھ لے کر چلتی تھی اور جس کی ہر مضراب سے سروں کی راگنی پھوٹتی تھی۔

خطوط نگاری کی اہمیت دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو زبان میں بھی ہے۔ خطوط کے مطالعہ سے صرف کاتب کے افکار و آراء ہی کا پتہ نہیں چلتا ہے بلکہ زندگی کے بہت سے گوشے بھی بے نقاب ہوجاتے ہیں۔ خط میں وہ آزادانہ باتیں ہوتی ہیں جو مکتوب نگار کی سیرت و شخصیت کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے مکتوب نگاری کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ذہن میں کوئی خیال ہو یا نہ ہو خط لکھا جاسکتا ہے۔ جس طرح بات چیت کے لئے کسی موضوع کا نہ ہونا اس کے ہونے سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ اسی طرح خط میں نہ اصول کی ضرورت ہے نہ خیال کی ضرورت، نہ موضوع کی ضرورت، زندگی اپنی راہیں خود بنا لیتی ہے۔ خط اپنی باتیں خود پیدا کر لیتا ہے۔''

ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول:

> ''خلاصہ کلام یہ کہ خط بڑا ہی نازک فن ہے۔ یہ کاریگری بھی ہے اور آئینہ سازی بھی، یہ مختصر اور محدود بھی، اور وسیع و بیکراں بھی۔ یہ حد سے زیادہ شخصی بھی ہے۔ مگر اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی۔ اس میں دانش بھی ہے اور بینش بھی۔ بظاہر کچھ بھی نہیں مگر اس کا ہر ورق بھی دفتر ہے۔''

مندرجہ بالا افکار و آراء کی روشنی میں اب ذرا ''غبار خاطر'' پر کچھ باتیں براہ راست کرلی جائیں۔ مولانا کی مکتوب نگاری کی کئی اقسام ہیں۔ عام آدمیوں کے نام، حکام وقت اور عمال دفاتر کے نام اور علماء کے نام ان تمام خطوط کے درمیان نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ بے شک مولانا کا اپنا ایک انفرادی انداز ہے جو ہر جگہ جداگانہ ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا۔ ادبی اسلوب، معلوماتی چیزیں، شخصی ٹچز (Touches) ان کے نام لکھے گئے خطوط میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اس سلسلہ میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ بیدار کہتے ہیں کہ چونکہ مولانا باضابطہ عالم تھے۔ ایک پروقار شخصیت کے حامل تھے اور سماجی مرتبہ اتنا بلند تھا کہ ذاتی جذبات جو انسانی جذبات تھے ان کے اظہار کا ان کے پاس موقع نہ تھا۔ اس اظہار کے لئے مولانا نے خطوط نویسی کی پناہ اختیار کرلی:

> ''انہوں نے اس کے لئے یہ پیرایہ اختیار کیا اور مکتوب کو واقعی مکتوب کی حیثیت دینے کے لئے جابجا ایسے شخصی ٹچز بھی دیئے جن سے یہ پتہ چلے کہ یہ مخاطب ہی کے لئے کہے گئے ہیں۔''

''غبار خاطر'' کو خاص طور پر خط کے زمرے میں اس لئے بھی شامل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس میں بیحد طوالت ہے جس کی وجہ سے یہ ایک مضمون بن کر رہ گیا ہے۔ اس اعتراض کا جواب عبدالقوی دسنوی نے دوٹوک انداز میں یوں دیا ہے:

> ''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خط نگاری طوالت یا اختصار کی کوئی قید لگائی گئی ہے؟ کیا وہ خطوط جن مضمون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے خط کہلوانے کی مستحق نہیں ہوتے اور کیا مولانا نے اس سے پہلے طویل خطوط نہیں لکھے ہیں؟ تو ان کا جواب اس کے سوا اور کیا دیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کی کوئی قید یا پابندی نہیں لگائی گئی ہے اور مولانا نے ان خطوط سے پہلے بھی طویل خطوط لکھے ہیں۔''

اس طرح ان بنیادوں پر ''غبار خاطر'' کے مکمل مجموعہ کو جس میں ذاتی تاثر بھی ہے، شخصی ٹچز بھی ہیں، سماجی اور سیاسی حالات کی آئینہ داری بھی ہے اور قید و بند کی صعوبتوں کا ذکر بھی۔ ان تمام حقائق کو نظر انداز کر دینا اور یہ کہہ دینا کہ صرف انشاء پردازی ہے، حقیقت سے منہ موڑنا ہوگا۔ مولانا نے بھی اسے خط ہی کہا ہے اس لئے ہم اسے خط ہی کہیں گے۔ یہ دراصل قید خانہ میں ان کی خاطر پر جمع غبار تھا جو نوک قلم سے جھڑ جھڑ کر اور بکھر بکھر کر صفحۂ قرطاس پر جم جم گیا۔ اس سے قلم کار کا فکری تکدر دور ہوا۔ طبیعت ہلکی ہوئی۔ دل و دماغ نے بوجھل پن سے نجات پایا۔ کسی ہمدم و ہمراز سے مولانا نے تصور کی آنکھیں ملائیں۔ غم دوراں اور غم جاناں کی ساری حکایتیں جو بیان کا وسیلہ ڈھونڈ رہی تھیں اور گوشۂ دل میں چھپ کر بیٹھی ہوئی محو انتظار تھیں انہیں اپنے ہمدم و ہمراز کے دلوں تک منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

''غبار خاطر'' مولانا کے اسلوب نگارش کا ایک نادر الوجود نمونہ ہے۔ ان کی یہ قلم برداشتہ تحریریں۔ معاشرتی، تاریخی، تہذیبی اور ادبی چمک دمک کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ جب وہ قلم اٹھاتے ہیں تو لفظ لفظ گنجینۂ معانی بن جاتا ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، علم اور ادب کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ یہ مولانا کی انفرادیت بھی ہے اور ان کی ممتاز خصوصیت بھی۔ خاص مسائل، واقعات حالات اور جذبات کو پیش کرنے میں مولانا کی ایک انفرادی شان نظر آتی ہے۔ ان میں ان کا ایک رچا ہوا انداز بھی جھلکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کا اسلوب منفرد بن گیا۔ قاضی عبدالستار کے مطابق:

> ''غالبؔ ہی تنہا ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنی نثر اور نظم کا انداز اپنے ہی لئے مخصوص کر لیا تھا۔ کبھی کوئی ادیب اس کی تقلید نہ کر سکا۔ لیکن مولانا غالبؔ کی اس خصوصیت سے بھی دو قدم آگے نکل گئے اور انہوں نے جو کچھ لکھا اسے اپنی بے مثل شخصیت کے قدرتی سانچہ میں اس طرح ڈھال دیا کہ بہت سے اہل قلم اس طرز تحریر کو اپنانے کی

کوشش کر کے ہار گئے۔ لفظوں کی قوت اور جذبات کی بے پناہ روانی
کے ساتھ مولانا کا طرزِ تحریر ایک لطیف آرٹ بن گیا۔"

مولانا نے کبھی کسی کی تقلید کو پسند نہیں کیا۔ ہمیشہ دوسروں سے مختلف رہے:

"افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو
میرا شناسا ہو، میں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس ملک میں، میں ایک
بے یار آشنا، غریب الوطن ہو۔ "غبار خاطر" اس عظیم شخصیت کا صنم
کدہ ہے جہاں اس نے خود اپنے حسن کو مختلف پہلوؤں سے دیکھنے کی
کوشش کی ہے۔ ہر بڑا فنکار اپنی انانیت کا شکار اور اپنی انا کا گرفتار
ہوگا ہے۔ جب اس کا جینئ (اس کی عبقریت) زندگی کی کھردری
حقیقتوں سے ٹکراتا ہے تو وہ لہولہان انا کا نوحہ بن جاتا ہے۔ 'جس جنس
کی عام مانگ ہو وہ میری دکان میں جگہ نہ پا سکی۔ ادب میں،
سیاست میں، فکر و نظر کی راہوں میں جس طرف بھی نکل پڑا کسی راہ
میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔" (غبارِ خاطر)

مولانا عملاً شامل انجمن رہنے کے باوجود فطرتاً عجلت پسند تھے۔ "میں نے سیاسی
زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھ کو ڈھونڈ نکالا۔"
چنانچہ جب مولانا کو قید کی خبر سنائی جاتی تو وہ فرماتے کہ:

"جب کبھی کسی سے سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی
گئی تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی آدمی کے لئے سزا کیسے ہوسکتی
ہے؟"

یہی وہ زاویۂ نگاہ اور معیار نظر ہے جس نے مولانا کو ہر جگہ اور ہر حال میں آسودہ
دل و دماغ بنائے رکھا۔ وہ نہ مصائب سے گھبرائے اور نہ آزمائشوں سے متزلزل ہوئے قید
خانوں کی سنگین دیواریں یا سیاسی ہنگاموں کا طوفان۔ اپنوں کے سنگ ملامت ہوں

یا غیروں کے طنز و طعن کبھی کسی چیز نے انہیں پل بھر کیلئے بھی پریشان نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ مینارۂ عظمت کی طرح سر بلند رہے:

"آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا اونچا کرلے تو جسم کی آسائشوں کا فقدان اسے پریشان نہیں کر سکے گا۔"

مولانا کے سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ مولانا فطرتاً تنہائی پسند اور کم آمیز تھے لیکن ہم مشربوں اور ہم مذاقوں کے درمیان شگفتہ اور شیریں سخن بھی تھے۔ وہ بند رہتے تھے مگر اپنوں کے بیچ کھلنا بھی جانتے تھے۔ "غبار خاطر" ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انہوں نے اپنے جلوؤں کو بے حجاب کیا ہے۔ مولانا کے مزاج میں آگ اور پانی یکجا تھا۔ دہکتے ہوئے شعلوں سے اگر ان کی پیاس بجھتی تھی تو برف کی بے کراں پھیلی ہوئی سفیدی سے ان کی آنکھیں نور و سرور حاصل کرتی تھیں۔ موسم زمستان کی برفیلی ہوائیں ان کے اندر آگ بھڑکاتی تھیں اور آمد بہار سے ان کا غنچۂ دل کھل اٹھتا تھا۔ غبار خاطر میں یہ سارے جلوے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال ملاحظہ فرمایئے:

"میرا ذوق بادہ آشامی بغیر اس جام مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا۔ سبحان اللہ طبع بوقلموں کی رنگ آرائیاں دیکھئے۔ ایک طرف دریا سے ہم عنانی کا ذوق و شوق، دوسری طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی تشنگی۔"

یہ جام مرکب ہے۔ چائے اور سگریٹ مولانا جس کے رسیا تھے اس کے اظہار کا علامتی پیرایۂ بیان مولانا کا وصف خاص ہے۔ پھر ایک اور اہم بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مولانا نے غبار خاطر کے ہر خط کی ابتداء ثنائے صبح سے کی ہے۔ بقول شاعر۔

ہم ایسے اہل نظر کے قبول حق کے لئے
اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اسلوب احمد انصاری نے "غبار خاطر" کی نثر کو اچھی نثر تسلیم کرنے سے انکار کیا

ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''غبار خاطر کے خطوط میں بے ساختگی، عصری ہمدردی اور زندگی کے سخت وسست کو ہموار کر کے دلآویزی پیدا کرنے کا فقدان ہے۔ ان میں اچھی نثر کی خوبیاں نہیں ہیں۔ یہ خطوط نثری شاعری کی مایوس کن مثال بن گئے ہیں۔''

''غبار خاطر تو اس ضعف و پیری کی یادگار ہے جس میں انسان اپنے خول سے باہر نکل کر انحطاط وجود کا علاج محض اظہار و نمائش سے کرتا ہے۔ نمود ہستی کی یہ خواہش اس وقت بیدار ہوتی ہے جب انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب اپنے متعلق مجھے بھی کچھ کہنا چاہئے۔''

اس نفی عظمت کے باوجود آگے چل کر وہ اسی کتاب کو اپنی پسند یدگی کی سند بھی عطا کرتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی اصلاح کر کے اپنے دامن کو داغدار ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ پھر بھی غبار خاطر اپنی جگہ ایک اہم شاہکار ہے۔ کیونکہ اس سے اس کے مصنف کے ذہنی و نفسی ارتقاء کے انتہائی نقطے کا حال اچھی طرح معلوم ہوا ہے۔ یہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں مصنف نے اپنی سیرت کا جوہر بہ قلم خود اس طرح دکھایا ہے کہ اس کی ابتداء وانتہا اور اس کی زندگی کی ارتقائی فضا بھی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔

''غبار خاطر'' پر اعتراض کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے مولانا آزاد کی اس کتاب کو مکاتیب کا مجموعہ تسلیم کرنے کے لئے مکاتیب غالب کو کسوٹی کی طرح سامنے رکھا ہے۔ حالانکہ مولانا کے مکاتیب، اپنی مثال آپ ہیں۔ اسی لئے یہ فقید المثال بھی ہیں صاحب جمال بھی ہیں اور سچ پوچھئے تو یہ پری تمثال بھی ہیں۔

مولانا رجب علی بیگ سرورؔ کی مرصع کاری، محمد حسین آزادؔ کی رنگین بیانی، شبلیؔ نعمانی کی جمالیت پسندی، عربی ادبیات اور خصوصاً قرآن کریم کے اسلوب کی معجز نمائی، فردوسیؔ اور انوریؔ کے تزک واحتشام، اپنی براہیمی عقلیت پسندی اور جذبہ پروری، کا کرب وصبر ملا کر وہ

رنگ انشاء ایجاد کیا کہ جوانہیں کے ساتھ ختم بھی ہوگیا۔ آج کی صورت حال یہی ہے کہ نئی نسل، اسے سمجھنا تو دور کی بات ہے صحیح صحیح پڑھ بھی نہیں سکتی ہے۔ اس کا اظہاری اسلوب (Expressie Style) اس کی خود کلامی (Soliliquy) اس کی تشبیہات و استعارات اس کے الفاظ و معانی کی ہم آہنگی، موسیقیت کا فطری رچاؤ اور مناظر قدرت کی عکاسی مولانا کے اعلیٰ اور منفرد اسلوب کی غمازی کرتا ہے۔ یہ مولانا کی عبقریت ہے جو مولانا کو کسی ایک خانہ تک محدود نہیں رکھ سکتی بلکہ ان کے جملوں اور فقروں سے خیالات و افکار کے کوندے لپکتے ہیں اور قاری کے دل و دماغ میں خوشبو کی طرح بس جاتے ہیں۔

اور تب۔ مولانا اپنی انفرادی عظمت کے اس مقام پر متمکن نظر آتے ہیں کہ جن تک پہونچنا جب مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا ہے تب کچھ مایوس لوگ ''انگور کھٹے ہیں'' کہہ کر اس شاخ انگور کے سایہ سے اپنے گھر لوٹ آتے ہیں۔ اور گھر کی چہار دیواری کے اندر سے اس انگور کی شاخ ثمر دار پر پتھر اچھالنے لگتے ہیں۔

☆☆☆

(۱۹۶۸ء)

علامہ جمیل مظہری
(تنازع للبقا کا شاعر)

یہ میرا فن زندگی کے صحرا میں وہ درختوں کا سلسلہ ہے
جو لو سے جھلسے ہوئے مسافر کو دور ہی سے بلا رہا ہے

شاعری......ہاں وہی شاعری جو عظیم ہوتی ہے۔ میتھو آرنلڈ کے مطابق زندگی کو سرور و انبساط عطا کرتی ہے۔ عظیم شاعری کے لئے یہ اتنی کڑی شرط ہے کہ ہر شاعر اس شرط پر کھڑا نہیں اتر پاتا ہے اور جس کی شاعری اس مقام کو پالیتی ہے بلاشبہ اس کی شاعری عظیم ہو جاتی ہے۔

اس وقت دنیا کی عظیم شاعری کے برابر اگر ہم اردو کے کسی شاعر کا کلام رکھنا چاہیں گے تو عہد حاضر کے اردو کے ایک بڑے نقاد (بلکہ سب سے بڑے کہا جائے تو یہ بھی روا ہوگا) کی برافروختگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ بھی تو سراسر ناانصافی ہوگی اور اپنے فنکاروں کی صلاحیتوں کے اعتراف سے چشم پوشی ہوگی صرف ایک بڑے نقاد کی ناراضگی کے ڈر سے ہم اردو میں عظیم شاعری کی تلاش چھوڑ دیں جب انگریزی زبان کے ایک نقاد نے یہ کہہ دیا ہے کہ عظیم شاعری سرور و انبساط کا ذریعہ ہے۔ اور ایک دوسرے انگریزی کے تنقید نگار کا یہ خیال بھی سامنے ہے کہ شاعری تنقید حیات ہے۔ اس لئے ان پیمانوں پر ہمیں اردو کے کسی شاعر کو پرکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

علامہ جمیل مظہری کی تمام تر شعری کاوشوں کو جب ہم شاعری کے ان دو پیمانوں پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینے میں کوئی الجھن محسوس نہیں ہوتی کہ جمیل کی شاعری میں عظیم شاعری کی علامات و کیفیات معتد بہ مقدار میں

موجود ہیں ۔

جمیل اپنی سخنوری بھی فسوں گری ہے مصوری ہے
بنا کے تصویر مہہ جبینوں کی رنگ بھرتا ہوں آرزو کا

☆

تمہاری جوہر شناسیوں نے دیا تھا ہم کو غم محبت
ہماری وسعت پسندیوں نے بنایا اس کو غم زمانہ

☆

ہوس سود محبت کو زیاں کا احساس
اور غم عشق کا گھٹ کر غم دنیا ہونا

☆

برا ہو عقل کا کہ عشق کے مزے نہ آسکے
نہ تم فریب کھا سکے نہ ہم فریب کھا سکے

☆

مظہریؔ محبت کی الجھنوں کو مت کوسو
تم نے خود محبت کو فلسفہ بنایا ہے

محبت کو فلسفہ بنانا، عشق کے فریب کھانے کی تمنا کرنا، کبھی غم محبت کو غم زمانہ بنا کر اپنی وسعت پسندیوں پر اترانا، کبھی غم دنیا کے بالمقابل غم عشق کو محدود قرار دینا۔ یہ سب کے سب فکر کے عجیب تضادات ہیں جن کے درمیان سے گذر کر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آخر وہ کون سی مہمیز ہے جس کی ضرب سے جمیلؔ کا اشہب فکر عمر بھر رواں دواں رہا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ ہمیں ان کے یہاں اس عظیم شاعری کو بھی تلاش کرنا ہے جو سرور انبساط کا سبب بھی بنے اور جو تنقید حیات بھی ہو۔

یوں تو جمیلؔ مظہری پر لکھنے والوں نے جن میں اردو کے کچھ معروف اور مقبول

تنقید نگار بھی ہیں اور کچھ چلتے پھرتے لوگ بھی ہیں جمیل کی شاعری کے اصل محرک کی تلاش میں خوب ٹامک ٹوئیاں کھائی ہیں۔ ان کی حیثیت ان نابینا ہندوستانیوں کی ہے جنہوں نے ہاتھی کے کسی ایک عضو بدن کا جائزہ لے کر مکمل ہاتھی کا خاکہ پیش کیا تھا۔ سیمنار میں پڑھے گئے مقالے رسالہ کے خصوصی شمارے اور مختلف مواقع پر شائع ہونے والے مقالے۔ سب کو نظر میں رکھئے۔

جمیل محض ایک رومانی شاعر تھا۔ جمیل ایک خدا بےزار فلسفی تھا۔ جمیل ایک گم کردہ راہ مفکر تھا۔ جمیل عقلیت اور شیعیت کا مرکب تھا۔ جمیل صرف احساس کا شاعر تھا۔ وغیرہ وغیرہ میرے نزدیک جمیل کا احساس اس کی عقلیت، رومانیت، خدا بےرازی، گم کردہ راہی یہ سب کی سب اس کی اس ناکامی کی پیداوار تھی جو میری نگاہ میں جمیل کا تنازع للبقا تھا۔

جمیل اپنی شعوری زندگی کے روز اول سے جینے کے تمام تر حوصلوں کے باوجود جینے کی ہر کوشش میں مکمل طور پر ناکام ہوتا چلا آرہا تھا۔ شاعر کی معاشی زندگی ناکام تھی۔ اس کی سیاسی تگ و دو لاحاصل رہی۔ اس کے عشق نے ناکامی کا منہ دیکھا۔ اس کے مذہبی تصورات نے اس کے سامنے ایڑیاں رگڑیں۔ الغرض اس نے جہاں بھی سکھ کی تلاش کی وہیں اسے دکھ سے واسطہ پڑا۔ لیکن اس کے اندر جینے کا زبردست حوصلہ تھا۔ اس کے باوجود جینے کے یہ مواقع ہمیشہ اس سے چھنتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جینے کے لئے عمر بھر لڑتا رہا پھر بھی جی نہ سکا۔ یہاں تک کہ وہ موت جس کے لئے اس نے خالق کائنات کی غرور کبرائی پر لعنت بھیجی تھی وہ آگئی اور جمیل چلتے بنے۔

کچھ اس نے بلک بلک کے مانگا ہوتا ۔۔۔ بچہ تیرا نزاع میں سسکتا ہوتا
تخلیق کی لعنتوں کو سمجھا ہوتا ۔۔۔ اس وقت غرور کبریائی تیرا

جب زندگی کا انجام موت ہے تو پھر جینے کی جو مہلت ملی ہے اس مہلت کو شاعر سکون اور اطمینان سے گذارنا چاہتا ہے۔ صد حیف کہ وہ سکون و قرار عمر بھر اسے نصیب نہیں ہو سکا۔ وہ چاہتا تھا کہ یا تو اتنی تاریکی بڑھے کہ تمام راہیں مفقود ہو جائیں یا اگر روشنی بڑھتی

ہے تو وہ اتنی بڑھے کے تمام راستے صاف صاف نظر آئیں۔ لیکن اندھیرے اور اجالے کی چشمک اور دھوپ چھاؤں کے سلسلے نے جمیلؔ کو کہیں کا نہیں رکھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سویرا کردے
دو کام میں ایک کام تو میرا کر دے
یا روشنی تیز کر کہ کچھ دیکھ سکیں
یا اور بھی گھنگھور اندھیرا کر دے

☆

کیسا پردہ جمیلؔ کیسا جلوہ
دیتا رہا تیرگی کو دھوکا جلوہ

☆

گہرے سوتے گئے حجابات فریب
چلاتی رہی نظر کہ جلوہ جلوہ

جلووں کی یہی تلاش جمیلؔ کا اصل مقصود تھا۔ لیکن تلاش کی ناکامی نے ان کے اندر ایک طرح کی قنوطیت پیدا کر دی تھی۔ جمیلؔ کی یہ قنوطیت ظاہری قنوطیت تھی۔ جب کہ اس قنوطیت کی زیریں لہر کے بطور رجائیت اور بھرپور رجائیت اس کے اندر موجود تھی۔ یہی وہ رجائیت ہے جس نے اسے عمر بھر ''تنازع للبقا'' میں مشغول رکھا۔ جمیلؔ زندگی کے کسی موڑ پر زندگی کے میدان سے بھاگے نہیں بلکہ وہ پوری شان سے اور پوری ہمت کے ساتھ کارگہہ حیات میں ڈٹے رہے یہاں تک کہ زندگی شکست کھا گئی اور وہ مٹی کے تلے روپوش ہوگئے۔ لیکن اس روپوشی نے جمیلؔ کی شخصیت اور شاعری کو ادب کی زمین پر زندہ چھوڑ دیا۔ ایسا صرف اس لئے ہوا کہ جمیلؔ کی شاعری میں عظیم شاعری کی علامت موجود تھی۔ ع

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

جمیلؔ تیرگی سے محبت کرتے نظر آئے تو صرف اس لئے کہ روشنی ان سے جینے کا حق چھینتا

چاہتی تھی ؎

کہو نہ یہ کہ محبت ہے تیرگی سے مجھے
ڈرادیا ہے پتنگوں نے روشنی سے مجھے

مگر جب بھی ان کے فہم وشعور کی روشنی نے ان کا ساتھ دیا وہ حصول منزل کے لئے نکل پڑے اور بڑھتے ہی چلے گئے ؎

فریب کھائے ہیں رنگ وبو کے سراب کو پوجتا رہا ہوں
مگر نتائج کی روشنی میں خود اپنی منزل پہ آرہا ہوں

☆

بہت اونچا غبار راہ امکاں کردیا ہم نے
بلندی کو قریب ذہن انساں کردیا ہم نے
شب غم کی سیاہی سے فسانہ لکھ کے ہستی کا
تمنائے سحر کو زیب عنواں کردیا ہم نے

جمیلؔ کی یہ جہد مسلسل زندگی کے ہر موڑ پر قائم رہی۔ جب عشق کی چھاؤں میں جینا چاہا تو وہاں اس کا یہ حال ہوا ؎

یہ کیا ہوا مری عذرا یہ کیا ہوا تم کو
نظر اٹھاؤ خدارا یہ کیا ہو ا تم کو
یہ کیوں بدل گئی دنیا یہ کیا ہو اتم کو
مری نظر سے اب آنے لگی حیا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

تمہاری آنکھ سے بیگانگی ٹپکتی ہے
نیاز و ناز سے اک بے دلی ٹپکتی ہے
رخ اس طرف ہے مگر بے رخی ٹپکتی ہے
وہ کیا کرے کہ جو پا کر نہ پا سکا تم کو

یہ کیا ہوا تم کو

یہ کیا عتاب ہے شکرِ جفا تو کرنے دو
خلوص عشق کے سجدے ادا تو کرنے دو
گناہگار وفا کو وفا تو کرنے دو

پرائے درد کا احساس دے خدا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

یہ تھی جمیلؔ کے عشق کی ناکامی، اس ناکامی کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ اس ناکامی کا احساس جانبین کو تھا۔ یعنی دونوں اپنی اپنی جگہ ناکام تھے۔ اس طرح ان کی ناکامی نے تکمیلیت کا درجہ پالیا تھا ۔

ہمارے دل میں اب ارمان پل نہیں سکتے
اگر پلیں بھی تو کروٹ بدل نہیں سکتے
شکستہ ساز سے نغمے نکل نہیں سکتے

اب اس کو پھر نہ بجاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

اس کے بعد جمیلؔ عشق کی دنیا سے اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اٹھ آئے ۔

یہ سمجھ لے خواب دیکھا، تھا نشاطِ زندگی کا
یہ سمجھ لے وہ محبت، نہیں کھیل تھا کسی کا
کہ بھرا تھا اک کھلاڑی، نے سوانگ عاشقی کا

ہوا ختم جب تماشہ تو نہ پردہ کیوں گرا دے
اسے بھول جا بھلا دے

یہ کمال بے نیازی یہ مآل زندگانی
کہ سراب کی پرستش میں گذار دی جوانی

یہ وہ تشنہ کام دل ہے کہ ملا نہ جس کو پانی

تری گمرہی کی فطرت تجھے داد دے تو کیا دے

اسے بھول جا بھلا دے

اس طرح جمیل اسے بھول بھلا کر رومان کی بستی سے خود بھی نکل گئے۔سوچا کہ محبت راس نہ آئی تو کیا ہوا دل کی دنیا ویران سہی، ذرا جسم کی دنیا تو آباد کرلی جائے۔اس آرزو کے ساتھ وہ معاشی جدوجہد کے میدان میں اترے۔امیروں اور جباروں سے انہوں نے جینے کے امکانات مانگے۔اس کے لئے شاعر نے علمی دنیا سے فلمی دنیا تک کی دوڑ لگائی لیکن ہر جگہ جیتنے کی ہر کوشش کا نتیجہ مایوسی اور ناکامی کی شکل میں نمودار ہوا ؎

شب ہجراں وہاں تیری درازی کون ناپے گا
جہاں فاقہ کشوں کے دن بڑی مشکل سے ڈھلتے ہیں
بہت اونچا غبار راہ امکاں کر دیا ہم نے
بلندی کو قریب ذہن انساں کر دیا ہم نے
دل مزدور سے قطرے نچوڑے خون ارماں کے
اور ان سے وقت کے سینے میں طوفاں کر دیا ہم نے
محبت نے جو دی تھی آگ اس کا یوں لیا مصرف
کہ گرم اس سے تنورِ قلب دہقان کر دیا ہم نے
نقابیں نوچ کر حرص و ریاکاری کے چہروں کی
بناتِ عصمت و تقویٰ کو عریاں کر دیا ہم نے
محبت کے لہو سے بھی جراثیمِ خودی نکلے
دل اس کا چیڑ کر دنیا کو حیراں کر دیا ہم نے

اس طرح شاعر نے ترقی پسندی کی سرخ چادر اوڑھ لی اور اس دنیا میں جہاں ترقی پسندوں کا بول بالا تھا اپنی دنیا بنانے کی کوشش کی۔لیکن ان تمام کوششوں کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔نہ

مزدوروں کی دنیا بدلی نہ شاعر کی۔اس شکست کی آواز جمیل کے دل سے اس انداز میں نکلی ۔

اے میرے خدا جس مٹی سے جباروں کے دل بنتے ہیں
اس مٹی میں مجبوروں کے کچھ آنسو بھی شامل کردے

شاعر صرف خدا سے دعا کر کے انتظار قبولیت میں بیٹھ نہیں گیا بلکہ وہ خود بھی جہد و عمل کی دنیا میں پلٹ آیا۔ جینے کے لئے جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ شاعر اسے ہی اصل حیات قرار دے کر یہ پیغام اپنے قارئین کو دینے لگا ۔

چل اے کشتیِ شوق بیچارگاں چل
ہوائیں کریں گی تری ناخدائی
مزدور کے نغموں سے سنکتی ہیں ہوائیں
تیشہ سے رجز کے جو نکلتی ہیں صدائیں
ہلتی ہیں فضائیں

ساتھ ان کے دھڑکتا ہے دل کون ومکاں چل

اے مرد جواں چل

عالم کی ہوا آج جنوں خیز ہے تجھ سے
تاریخ کی رفتار کہیں تیز ہے تجھ سے

مہمیز ہے تجھ سے

لے عزم کے ہاتھوں میں زمانے کی عناں چل

اے مرد جواں چل

☆

سینوں میں طوفاں جو اٹھائے اک عزمِ بیتاب
بہہ جائیں جذبات کی رو میں عقلوں کے گرداب
من کی گرتی اٹھتی موجیں بن جائیں سیلاب
اور سیلاب کا بڑھتا پانی دنیا کو لے گھیر
وقت کا دھار پھیرنے والے وقت کا دھارا پھیر

جز سعیِ دوام اور کیا ہے
شاعر کا پیام اور کیا ہے
یعنی اس میکدے کی رونق

اک گردشِ جام، اور کیا ہے
انساں کا کام، اور کیا ہے

کوشش ہے رازِ نظمِ ہستی
جنبش ہے دلیلِ زندگانی
اے سنگِ وجودِ آدمی زاد

پانی میں اگر نہ ہو روانی
پانی کو کون کہے گا پانی

جینے کی مسلسل جنگ میں مبتلا شاعر جینے کی راہ نکالتا ہے۔ خود بھی اس پر چلتا ہے اور دوسروں کو بھی اس پر چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں وہ چلتا چلتا اپنی آخری پناہ گاہ یعنی سایۂ خالق ارض و سماوات تک پہنچ کر، وہاں پناہ لینا چاہتا ہے۔ اس کی مسلسل ناکامی اسے دیوانہ بنا دیتی ہے لیکن وہ۔ ع با خدا دیوانہ شو، و با محمدؐ ہوشیار
کا انداز اختیار کر لینا چاہتا ہے۔ جمیلؔ مظہری کی شاعری کا یہ آخری مرحلہ ہے ایسے لوگوں کے لئے جو خدا کی بندگی کا مجہول تصور رکھتے ہیں، تصوف پسندی کی رو میں بہہ کر خدا کے ایسے تصور کے قائل ہو جاتے ہیں جو صرف دعا و درود تک محدود ہو جاتا ہے۔ خدا اور بندوں کے درمیان عشق و عاشقی کے رشتے اور اس کے تیور و انداز کو ایسے لوگ شوخی و گستاخی اور بدتمیزی قرار دیتے ہیں۔ جمیلؔ کو ایسے لوگ رد کر دیتے ہیں کئی لوگ اس انتشار کا شکار ہو گئے ہیں۔ حالانکہ جمیلؔ صرف شوخ اور گستاخ ہی نہیں عاجز اور خود سپردہ بھی ہیں ؎

ہم نے بھری بہار میں مانگی تھی اک کلی
سَو زخم دے دیئے چمن روزگار نے

تو بھی پیاسا ہے اور ہم بھی
پیاسا ہے ستار بھی قلم بھی
یہ کار گہہ زیاں پرستی
رنگ اور سراب کی ہے بستی
نفرت ہو یہاں کہ ہو محبت
دونوں پہ ہے تشنگی کی حالت
ہر جذبۂ ناصبور پیاسا
دانش پیاسی شعور پیاسا
مزدوری و بندگی بھی پیاسی
دارائی و خواجگی بھی پیاسی
پیاسا ہے جنوں بھی اور خرد بھی
پیاسا ہے غرور بھی حسد بھی
حق یہ ہے کہ دوستی بھی پیاسی
حد یہ ہے کہ دشمنی بھی پیاسی

(مثنوی آب وسراب)

یہی وہ پیاس ہے کہ جس کی بنیاد پر لوگوں نے جمیلؔ کو تشنگی کا شاعر قرار دے دیا لیکن یہ تشنگی نہیں۔ دراصل یہ وہی تنازع للبقا ہے جو میری نظر میں شاعر کا وصف امتیازی ہے۔ یعنی شاعر جینے کی مہلت چاہتا ہے ؎

جمیلؔ اس دل کی بانسری میں بہت سے نغمے بھرے ہیں لیکن
جسے سنانے کی تھی تمنا اسی نے اب تک سنا نہیں ہے

جمیلؔ کی شاعری کی یہ ایک وسیع دنیا ہے۔ یہاں فکر میں تضاد بھی ہے اور پہلوداری بھی۔ جمیلؔ خدا سے بیزار بھی ہوتے ہیں اور مکمل طور پر اپنے آپ کو خدا کے سپرد بھی

کر دیتے ہیں۔ جمیلؔ کے نزدیک انسان دنیا میں جتنی بھی غلطیاں کرتا ہے اس کا ذمہ دار انسان بہت کم ہوتا ہے اس لئے کہ وہ سراسر مجبور ہے۔ اس پر مختاری کی تہمت لگا دی گئی ہے۔ (حالانکہ دنیا پرستوں کے لئے یہ ایک فراری تصور ہے۔ اور مجبوری و مختاری کے عدم توازن کی پیداوار ہے۔ پھر بھی شاعر کا یہ خیال ہے تو تنقید کی غیر جانبداری ہم سے تقاضہ کرتی ہے کہ شاعر کے اصل تصور کو ہم ضرور زیر مطالعہ و بحث لائیں)۔

اپنی مثنوی ''جہنم سے'' میں جمیلؔ نے ایک ایسے شخص کی خرابیوں کو نمایاں کیا ہے جسے فرشتے گھسیٹ کر جہنم میں لے جا رہے ہیں۔ جمیلؔ نے اس کی جو وکالت کی ہے ذرا اسے بھی دیکھئے۔

میں شاعر تھا انسانیت کا وکیل — بڑھا جانب عرش ربِ جلیل
کہا یہ جھکا کر جبینِ نیاز — کہ اے خالق دو جہانِ مجاز
یہ بوڑھا جو سچ مچ ہے بچہ ترا — مزاجاً تھا اک عکس سچا ترا
سراپا خودی و مجسم غرور — بڑا زود حس اور بڑا ذی شعور
مقابل میں اس کے جو ابھرا کوئی — ہوا جس سے اندیشۂ ہمسری
کیا مطلقاً پارہ پارہ اسے — نہ تھا شرک مطلق گوارہ اسے
یہ کوشش تھی اس کی کہ ہو جائے ٹھیک — تری طرح سے وحدۂ لاشریک
ہے جس طرح تجھ کو عبادت پسند — خوشامد تھی اس کو نہایت پسند
تری طرح تھا یہ بھی رب الکبار — کمینوں، رذیلوں کا پروردگار
انہیں پر کرم اس کا زرپاش تھا — گدا کوئی مانگے تو قلاش تھا
تھی یہ بھی بہر حال سنت تری — نہیں ہوتی مفلس پہ رحمت تری
غلط کیا جو یہ مانگتا تھا ادب — حقیروں سے تو بھی ہے سجدۂ طلب

اس طرح جمیلؔ دنیا کے تمام ظالموں، جباروں اور قہاروں کی حقیقت نمایاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا بے باکانہ انداز، ان کی خدا بیزاری نہیں۔ بقول عبدالمغنی:

''خدا سے روٹھنے اور مچلنے کی یہ خجالت جمیلؔ مظہری کا مزاج تغزل اور آہنگ فکر ہے۔ اس میں خدائی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ بس بندگی کا ایک تیور ہے۔ جس کو کبھی وہ ناز سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی نیاز سے۔ مگر ہر حال میں اس کا ماحصل انفعال شکستگی اور حسرت کی وہ کیفیات ہیں جو عناصر نیاز ہیں۔''

یہ جمیلؔ کا مزاج تغزل ہی نہیں مزاج شاعری بھی تھا اپنی غزلوں اور نظموں ہی میں نہیں بلکہ اپنی رباعیوں، قطعات اور مثنویوں میں بھی جمیلؔ نے اپنا یہ رنگ و آہنگ برقرار رکھا ہے ۔

اے دعا مانگنے والے تری ہر دم کی دعا
اب خدا کے لئے دشنام ہوئی جاتی ہے

☆

کبھی وہ بھی زندگی تھی کہ خدا خجل تھا مجھ سے
کبھی یہ بھی زندگی ہے کہ خجل ہوں میں خدا سے

☆

جھکایا تو نے جھکے ہم برابری نہ رہی
یہ بندگی ہوئی اے دوست عاشقی نہ رہی

☆

جو سجدۂ شکر میں جھکا ہے ہنسو نہ اس فاقہ کش گدا پر
خدا نہ کردہ یہ وقت آئے کہ بندگی طنز ہو خدا پر

☆

میں اِدھر اُدھر جو بڑھا رہا ہوں ہوس کے دست دراز کو
مری زندگی کا یہ طنز ہے تری شان بندہ نواز پر

جمیلؔ کبھی مجہول ہو کر بیٹھنا نہیں چاہتے۔ وہ لڑ جھگڑ کر اپنا حق وصولنا چاہتے تھے

۔زندگی کی مہلت خالق زندگی سے مانگتے تھے۔خدا کی رحمتوں پر انہیں بھروسہ ہی نہیں۔اس پر ان کا مکمل ایمان تھا وہ جانتے تھے کہ ؎

وہ نہیں دے گا نہیں ہے یہ شریعت اس کی
مانگنے والے ذرا مانگ دعاؤں کی طرح

(ظفر حبیب)

اسی لئے وہ ہر حال میں مانگتے رہے ؎

خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں یہی نہ معنی ہے اس کے واعظ
وہ ابر رحمت کا منتظر ہو، مکان جلتا ہو جب کسی کا

☆

اپنے بکھرے ہوئے جلووں کی قسم ہے تم کو
رحم کر میری پریشاں نظری پر اے دوست

☆

نہ اپنے دل کی لگی بجھایوں نہ کر جہنم کا تذکرہ یوں
سنبھال اپنے بیاں کو واعظ کہ آنچ آنے لگی خدا پر

☆

اے نالۂ بے کساں، تو پیمبروں کی دعا نہیں
سر عرش تیری جگہ کہاں، اتر آ قلوب گداز میں

☆

زخم دل تو کیا دوگے داغ سجدہ ہی دے دو
اب تمہاری چوکھٹ سے مظہری کہاں جائے

☆

میں خدا کو پوجتا ہوں میں خدا سے روٹھتا ہوں
یہ وہ نازِ بندگی ہے جسے پوچھئے خدا سے

یہ سب شاعر کے اندر کا انتشار ہے اور یہ انتشار پیداوار ہے اسی تنازع کی ؎

یہ ٹکر دو ارادوں کی ہے ٹکر
میں اپنے آپ سے ٹکرا رہا ہوں

شاعر کی یہی اصل ٹکر ہے اور صرف اسی لئے ہے کہ وہ جینا چاہتا ہے لیکن یہ دنیا اسے زندگی عطا کرنے سے معذور ہے۔ وہ کیسی زندگی جینا چاہتا ہے اسے اس کی مثنوی ''جہنم سے'' میں ملاحظہ فرمائیے اور تب یہ باور کر لیجئے کہ جمیلؔ ''تنازع للبقا'' کا شاعر تھا ؎

بدل جائے پیمانۂ خیر و شر
یہ انساں یہ قدرت کا نور نظر
کھلونا ہے جو ان شیاطین کا
ہو ضامن دوعالم کی تزئین کا
بہشت اس کی ٹھوکر سے اگنے لگیں
گہر اس میں طاؤس چگنے لگیں
بدل جائے یک لخت تقدیر کل
جہنم کے طبقات ہو جائیں گل
ازل سے جو ہے موت کی گھات میں
پھنسا دے اسے چاہ ظلمات میں
حقیقت بنے سرمدیت کا خواب
کہ ہے خوابِ شاعر مشیت کا خواب
مشیت کے خدّام دانا کا خواب
محمدؐ ، کرشنؑ اور موسیٰؑ کا خواب
تسلی یہ غم ہائے گوتمؔ ملے
مسیحا کے زخموں کو مرہم ملے
ضیا دیکھ کر خاک یک مشت کی

تپش ختم ہو قلبِ زرتشت کی
کریں رقص ٹیگورؔ کی کلپنائیں
کبیرؔ اور نانکؔ بھجن مل کے گائیں
غزل خواں ہو غالبؔ کی عرفیؔ کی روح
ہم آواز ہو ان سے شیلیؔ کی روح
جو فرمان معزولیت عام ہو
فرشتوں کی محفل میں کہرام ہو
کہے اٹھ کے پیہم زمیں کا غبار
کہ مٹی سے پسپا ہوئے نور و نار
مشیت کا لختِ جگر زندہ باد
خداوندِ نظمِ دگر زندہ باد

☆

(مطبوعہ: سہ ماہی زبان و ادب پٹنہ، فروری ۱۹۸۵ء)

امداد امام اثرؔ

(دبستان بہار کا اولین تنقید نگار)

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ''اردو تنقید کا ارتقاء'' میں مطالعہ کی سہولت کے پیشِ نظر اردو تنقید کے مختلف ادوار قائم کر کے ان کا عنوان طئے کیا ہے۔ ان کے قائم کردہ عنوانات نے مطالعہ میں سہولت پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے حالیؔ، شبلیؔ اور آزاد کے بعد کے دور کا نام ''متبعین اور شارحین کا دور'' رکھا ہے تقسیم ادوار کی اس سہولت کا سہارا لے کر میں بھی اپنے موضوع کی طرف اپنے قارئین کو لے جانا چاہتا ہوں۔

اردو تنقید کے تعمیری دور کے بعد ایک دور آتا ہے جسے عبادت بریلویؔ نے متبعین اور شارحین کا دور قرار دیا ہے۔ اور اس دور میں وحید الدین سلیم، امداد اثرؔ اور مہدی افادیؔ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جہاں تک اس مفروضے کا تعلق ہے وہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ان ناقدین کے خیالات بہت حد تک اگلے ناقدوں کے خیالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مگر یہ بات مکمل طور پر قابلِ قبول نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان ناقدوں کے بہت سارے خیالات، ان کا طرز فکر اور ان کے ذاتی تعلقات گذشتہ ناقدوں سے گہرے اور قریبی ہیں۔ ان میں اور ان کے اگلوں میں بہت سے اقدار مشترک ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ سب محض مقلدین ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم اس کا سرسری جائزہ پیش کرنا چاہیں گے۔

امداد امام اثرؔ کی مضبوط شناسائی سر سید احمد خاں سے تھی۔ سر سید کی تحریک کا انہوں نے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ سر سید کی طرح وہ بھی زندگی کے ترقی پسند تصور کے قائل تھے۔ ان کا دور تقریباً وہی تھا جو حالیؔ اور شبلیؔ کا تھا۔ فرق صرف مکاں کا تھا زماں کا نہیں۔ اس زمانہ میں

حالؔی بڑھ چڑھ کر اور شبلؔی اور آزادؔ نسبتاً خفیف انداز میں اپنے جوہر تنقید کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہر طرف ان سہ حضرات کا شہرہ تھا۔ ہر صاحب علم و نظر ان کا ثنا خواں تھا۔ ہر جگہ، ہر محفل میں انہیں تحسین و آفریں سے نوازا جا رہا تھا۔ امداد اثرؔ کے کانوں تک بھی ان کی شہرت کا آوازہ پہنچا تھا۔ انہوں نے حالؔی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ مقدمہ کی کچھ باتیں انہیں بھلی لگیں تو بعض سے انہوں نے اختلاف بھی کیا۔ چنانچہ انہوں نے بھی تنقید پر قلم اٹھایا اور ایک بسیط کتاب تنقید ''کاشف الحقائق'' کے نام سے لکھ ڈالی۔

امداد امام اثرؔ ان محسنین اردو میں سے ہیں جنہوں نے مختلف جہتوں سے اردو کی خدمت کی ہے۔ آپ نے شاعری بھی کی ہے۔ ناول نویسی بھی، مذہبی مناظرہ میں بھی شریک ہوئے۔ تصنیف و تالیف بھی کی اور سب کے ساتھ تنقید پر بھی اپنے قلم کا زور دکھایا۔ آپ کی معرکتہ الآراء کتاب ''کاشف الحقائق'' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں نظریاتی تنقید پر بحث کی گئی ہے۔ شاعری کی تعبیر اور تعریف کی کوشش کی گئی ہے۔ غزل کی حمایت میں گہر افشانیاں ہوئی ہیں اور اردو شاعری کو دنیا کی دوسری زبان کی شاعری کے ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔ اثرؔ کا زمانہ وہ تھا کہ جب حالؔی نے موضوعِ غزل کی مخالفت کی تھی اور اسے بس اسی قدر روا رکھا تھا جس قدر کے اس میں علمی و اصلاحی مضامین جگہ پا سکیں۔ امداد امام اثرؔ نے حالؔی کے اس مفروضے کی مکمل تردید کی۔ وہ پند و نصیحت کے مضامین کو غزل میں داخل کرنے کو قطعی تیار نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ:

> ''اگر کسی کو یہ منظور ہے کہ پند و نصائح کھلے ڈلے طور پر داخل غزل کی جائے تو اسے اس امر کو فی الذہن رکھنا چاہئے کہ یہ صنف شاعری اس کام کے لئے موزوں نہیں ہوئی ہے۔ اس کام کے لئے اور اصناف شاعری درکار ہیں۔''

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ غزل کو اس کے حقیقی معنوں میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اقتباس بالا سے ان کا مقصد صرف یہی ہے کہ وہ غزل کو اس خشک و بے

مزہ موضوع کے لئے استعمال کرنا نہیں چاہتے ہیں۔اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ حالی کے نرے مقلد نہیں تھے بلکہ کچھ اپنا نقطۂ نظر اور قوت استدلال بھی رکھتے تھے۔

شاعری کی تعریف میں بھی انہوں نے معنویت اور جامعیت اختیار کی ہے۔ انہوں نے شاعری کو''امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ'' کا بیان قرار دیا ہے۔اس کے علاوہ شاعری کی داخلی اور خارجی دوقسمیں بھی بتائی ہیں اور وہ شاعری کی ہیئت پر بھی زور دیتے ہیں۔

آثر کے زمانے میں شاعری پر طرح طرح کے اعتراضات ہورہے تھے۔معترض انگریزی ادبیات کا سہارا لے کر اردو شاعری کو بے بضاعت اور بے مایہ قرار دینے پر تلے ہوئے تھے۔آثر طنز ونکتہ چینی کے اس تیکھے تیر کو برداشت نہیں کرسکے۔ان کا شاعرانہ جذبہ جوش میں آگیا اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ اردو شاعری کی ماہیت، اہمیت اور عظمت کی دلیلیں پیش کیں بلکہ عربی، فارسی، انگریزی، جرمنی، جاپانی، فرانسیسی اور لاطینی، غرض کہ دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری سے اس کا موازنہ کیا اور اسے اس کا ہم پلہ قرار دیا۔ان کا یہ موازنہ نہ صرف یہ کہ اردو شاعری کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی علمیت اور بالغ نظری کا بھی پتہ دیتا ہے۔

مختلف زبانوں کی شاعری سے طویل مقابلہ وموازنہ کے باوجود آثر اس بات کے بھی قائل تھے کہ ہر زبان کی شاعری کو ملکی اور ملی خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے۔اسی وجہ سے وہ اس بات سے سخت رنجیدہ خاطر ہیں کہ اردو شاعری پر فارسی کی چھاپ کیوں ہے؟ اسے تو ہندوستانی معاشرہ، ماحول، تہذیب، ثقافت اور مناظر کا آئینہ ہونا چاہئے۔ان کے خیال میں:

> ''تقاضائے ملکی یہی تھا کہ اردو شاعری سنسکرت کی شاعری کا انداز پیدا کرتی۔''

شاعری کو ملکی وملّی خصوصیات کا حامل قرار دینے کے باوجود انہوں نے اس کے الہامی ہونے پر بھی زور دیا ہے۔آثر ہر ملک اور ہر قوم کے لئے شاعری کو ضروری قرار دیتے

ہیں۔ ان کے خیال میں وہ روح کو سچی خوشی بخشتی ہے۔ وہ شاعری کے اندر سادگی اور سلاست کی خصوصیات دیکھنا چاہتے ہیں۔ مبالغہ آرائی انہیں بالکل پسند نہیں۔ یہ باتیں کاشف الحقائق کے حصہ اول کے متعلق ہیں۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی کم اہمیت کا حامل نہیں۔ اس میں آثر نے شاعری کی تمام اصناف پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس صنف کے شاعروں پر ناقدانہ نگاہ بھی ڈالی ہے۔ آتش پر انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آج بھی حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''سحر البیان'' اور ''گلزار نسیم'' کا جو تقابلی مطالعہ انہوں نے پیش کیا ہے وہ بھی قابل دید ہے۔ اسی طرح سودا اور ذوق کے قصائد پر ان کی رائے بھی وقعت کی حامل ہے۔

اردو کی تمام اصناف شاعری میں مثنوی پر انہوں نے گہری نگاہ ڈالی ہے سحر البیان اور گلزار نسیم کے موازنہ میں جن خیالات کا وہ اظہار کر گئے ہیں آج کے شعلہ صفت اور بلند آہنگ ناقدین بھی نہ صرف یہ کہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں بلکہ اس کی ہمسری کی تاب نہیں رکھتے اور بہترے بلند نام تو ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ (میں ان کے نام گنانے سے قصداً پرہیز کر رہا ہوں)

ان تمام خوبیوں اور خصوصیات کے باوجود آثر کے یہاں چند ایسی نازیبا باتیں بھی ہیں جو مزاج قاری پر گراں گذرتی ہیں۔ سب سے پہلے چیز جو کھٹکتی ہے وہ ان کی نوابانہ ذہنیت ہے۔ وہ ایک نواب تھے اس لئے ضدی پن ان کا مزاج تھا۔ احساس برتری ان کا طرۂ امتیاز تھا اور ہٹ دھرمی ان کا شیوہ۔ وہ اپنا جو بھی خیال ظاہر کرتے تھے اس میں حد درجہ اصابت اور صلابت کے ساتھ ساتھ رعونت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے پیش کردہ حقائق میں اصلیت ہو یا نہ ہو قاری ان کے زور بیان اور ان کی سخت گیری سے اسے ماننے کو مجبور ہو جاتا تھا۔

ان کی دوسری کمزوری ان کا مسلکی اکڑپن تھا۔ اس معاملے میں عصبیت بھی ان کے یہاں روا تھی۔ وہ جب اپنے ہم مشربوں کی مدح شروع کرتے تو نہ صرف یہ کہ زمین و آسمان کے قلاوے ملا دیتے بلکہ مخالفین کو حد درجہ ذلیل اور ہیچ ثابت کرنے پر بھی اپنا پورا

زور صرف کر ڈالتے۔ ان کے اس مزاج نے اکثر سنجیدہ مزاج قاری کو بھی ان سے متنفر کر دیا اور اس سے ان کی تنقید کو سخت نقصان پہنچا۔ ان کے اسی رجحان کا نتیجہ ہے کہ وہ کہیں کہیں اپنی تنقید میں ایسا لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں کہ جسے انتہا پسندانہ کہا جا سکتا ہے۔

ان کی تنقید نگاری کو ان کی نشۂ ہمہ دانی اور قادر الکلامی نے بڑا نقصان پہونچایا۔ ان کی لفاظی، کبھی کبھی تجزیاتی اور تنقیدی زبان سے زیادہ مناظراتی و مکالماتی انداز اختیار کر لیتی ہے اور وہ ''سبحان اللہ کیا غزل سرائی ہے۔ سبحان اللہ کیا حسن کلام ہے۔'' جیسے جملے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ جس سے ان کی تنقید بہت حد تک مضحکہ خیز ہو گئی ہے۔

اثر کی ایک اور خامی جو نگاہوں میں کھٹکتی ہے وہ ان کی تحریر اور خیالات میں عدم توازن کا پایا جانا ہے۔ وہ شاعروں کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالتے وقت ان کے ماحول کا مکمل تجزیہ نہیں کرتے۔

اس طرح امداد امام اثر کی تنقید میں کئی خامیاں بار پا گئیں جس کی وجہ سے ان کی تنقید کو تاثراتی تنقید کے زمرہ میں شامل کر دیا گیا۔ اس کے باوجود اردو کے ابتدائی تنقید نگاروں میں ان کا عزت و احترام سے نام لئے بغیر تنقید نگاری کی تاریخ اپنا قدم آگے نہیں بڑھا سکتی۔ ان کی تنقیدات پر سرسید کے افکار و نظریات کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ انہوں نے اردو شاعری پر تنقیدی نقطۂ نظر سے اس وقت ایک ضخیم کتاب قلم بند کی جب تنقید نگاری کا رجحان اور تصور عام نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اردو شاعری کی تمام اصناف کے لئے چند اصول وضع کئے اس کے لئے وہ ستائش کے مستحق ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اردو تنقید نگاروں کے ہراول دستہ کے سپہ سالاروں میں سے ایک ہیں۔

نشر شدہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ

ستمبر ۱۹۷۱ء

☆☆

کلیم الدین احمد
(کی مجتہدانہ تنقید نگاری)

"اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر"........ اردو تنقید کے شیش محل میں یہ ایک دیوانے کا نعرۂ مستانہ ہے جس کی وجہ سے اردو تنقید کے ایوان میں ایک بھونچال سا رونما ہوا اور چشم زدن میں ایوان تنقید زمین بوس ہو گیا۔ یہ نعرۂ مستانہ لگانے والا انگریزی ادب کا ایک ایماندار طالب علم کلیم الدین احمد تھا جو مغربی علوم کے بحر ذخار میں پیہم شناوری کے بعد اپنے دامن میں لولو و مرجان بھر کر ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہوا تھا۔ علامہ اقبالؔ نے اپنے متعلق کہا تھا ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نہ ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

ٹھیک یہی بات کلیم الدین احمد پر بھی صادق آتی ہے۔ انہوں نے کسی بھی طرح کی لاگ لپیٹ سے اپنے دامن کو آلودہ کئے بغیر حق بینی، حق اندیشی اور حق گوئی کی رسم زندہ کرنے کی غرض سے تیشہ بدست اٹھے اور تصورات کے خیالی کوہ دماوند پر ٹوٹ پڑے۔ شاید اسی لئے انہوں نے اپنے لئے علامہ اقبالؔ کا یہ شعر پسند کیا ؎

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تو دے کو کہے کوہ دماوند

ہم ان کی تنقید کی فکری اساس کو قبول کریں یا یکلخت اسے رد کر دیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہمیں کلیم الدین کو پڑھنے سمجھنے اور ان کے نظریات کو ذہن نشیں کرنے کی پر خلوص کوشش کرنی چاہئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی ہر بات پیامِ پیمبری اور الہام

خداوندی ہے۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ قدیم تصورات تنقید اور اندازِ فکر کو چھوڑنے کی اگر ذرا بھی ہمارے اندر ہمت ہے تو ہمیں ان کے نظریات کی تفہیم کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔ کلیم کا انداز جارحانہ ہے ان کی زبان اور ان کی فکر میں جو اصابت وصلابت ہے اسے انگیز کرنے کی صلاحیت ہر کس وناکس میں نہیں ہوتی۔ خود کو نشانۂ ملامت بنانا کوئی پسند نہیں کرتا یا اپنی برائیاں اپنی نظر کے سامنے پیش کرنے والوں کو کوئی اپنا محسن نہیں سمجھتا۔ کلیم صاحب نے مقلد ہونے کی بجائے بطور خود غور وفکر کرنے کی دعوت اردو والوں کو دی ہے۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ سنی سنائی باتوں پر ہم فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ کلیم الدین نے لکھا ہے کہ:

> ''اپنی عقل اور صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرو، کسی فیصلہ میں دوسرے کی رائے کا سہارا مت ڈھونڈو، اچھے برے کی تمیز آپ کرو، جب قرآن اور حدیث کو خود سمجھنا واجب ٹھہرا تو پھر شعر وادب، تاریخ وفلسفہ اور سائنس کیا مال ہے۔ عقل کی آنکھ کھولو، سنو، پڑھو اور جو عقل بتائے وہی سمجھو''۔ (اپنی تلاش میں)

اپنی عقل کا سہارا لینا، اسے ہی رہبر قرار دینا، دوسروں کی رائے سے مرعوب نہ ہونا۔ مختلف النوع تصورات اور نظریات کے جنگل میں دراصل الہ دین کا چراغ ہے کہ اس سے تاریکی چھٹ جاتی ہے اور تاریکی کے بیوپاری کا بازار مندا پڑ جاتا ہے۔ سوچنے سمجھنے اور خود پرکھنے کی صلاحیت اگر انسان میں پیدا ہو جائے تو وہ کورانہ تقلید سے بعض آجائے گا اور ازلی اجارہ داروں کی دوکانیں مندی کا شکار ہو جائیں گی۔ کلیم صاحب روز اول سے اس اجارہ داری کے مخالف رہے۔

کلیم الدین احمد کے نظریۂ تنقید پر گفتگو کرتے ہوئے فضل الرحمٰن صاحب نے ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کے مقدمہ میں بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کلیم ان نوجوانوں میں نہیں جو ہرے نئے نقطہ نظر پر آمناو

صدقنا کہتے ہیں......وہ میدان تنقید میں کہنہ مشق ہیں۔ ادب انگریزی کے پروفیسر ہونے کی حیثیت سے فن تنقید ان کا پیشہ ہے۔ جو امتیازی صفات اس فن کے ماہر کے لئے لازمی ہیں وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ساتھ ساتھ انگریزی اردو اور فرانسیسی ادبوں پر کامل عبور رہے اور عربی فارسی کی کافی مہارت ہے۔ تنقید کے مختلف مقامات اور اس کے ہر پہلو سے واقفیت رکھتے ہیں۔''

اتنا ہی نہیں آگے چل کر انہوں نے اردو زبان وادب سے محبت اور شفقت رکھنے والوں کو یہ مشورہ بھی دیا ہے:

''ان کی تحریروں کو پوری دلچسپی اور دیانتداری سے پڑھیں۔ اس لئے کہ وہ محض جدت طراز نہیں ہیں بلکہ انہوں نے مختلف موضوعات پر رائے زنی کے لئے تمثیلات و تشریحات کا سہارا لیا ہے۔ ہر جگہ استدلال سے کام لیا ہے اور تاویلات سے احتراز کیا ہے۔ ان کے خیالات مدمغ ہیں اور زوایۂ نظر محققانہ مگر زبان میں روانی اور سلاست اور بیان میں شگفتگی ہے۔ کثرت استعارات اس کے شاہد ہیں کہ مصنف کی طبیعت شاعرانہ ہے اور احساس و ادراک بہت زندہ۔''

یہ اور ایسی باتیں کلیم صاحب کے متعلق اور بھی کئی لوگوں نے کہی ہیں۔ ہم ان باتوں کو اگر جمع کرنا بھی چاہیں تو اس احتراز برتیں گے اس لئے کہ کلیم صاحب نے یہ ہدایت دے رکھی ہے۔ اپنی عقل جو کہے وہی سمجھو۔

ذیل میں ہم کلیم صاحب کی تنقیدی صلاحیتوں کو اپنی عقل کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ مشہور اور بزرگ ہستیوں کے قول سے مرعوب ہونے کی غلطی سے بچے رہیں۔ کلیم الدین احمد کی تمام تحریریں، ہنگامہ خیز رہی ہیں لیکن جس کتاب نے سب سے

پہلے رستاخیزی پیدا کی وہ ''اردو تنقید پر ایک نظر'' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اس وقت کے مردہ اور زندہ دونوں طرح کے اردو کے مشہور فنکاروں پر بے لاگ تبصرہ کیا اور اپنی بنیادی آراء پر اول تا آخر اٹل رہے۔ ہم اپنی گفتگو اسی سے شروع کر کے اسی پر ختم کرینگے اس لئے کہ بقیہ ساری کتابیں درمیانی منزل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کلیم الدین صاحب کا خیال ہے:

''اپنی قوم، اپنے ادب کے ساتھ وفاداری ضروری ہے لیکن اگر وفاداری میں ہوش مندی، بلند ہمتی، دور بینی کے عناصر نہ ہوں تو یہ وفاداری، وفاداری نہ ہوگی۔ یہ نا سمجھی ہوگی۔ اندھی جذباتیت ہوگی۔''

اپنی قوم اور اپنے ادب سے سچی وفاداری ثابت کرنے کے لئے اور اندھی جذباتیت سے بچنے کے لئے وہ تنقید کی مقراض لے کر اٹھتے ہیں اور اردو زبان و ادب کے چمن کی ان تمام شاخوں کو کاٹ کر گرا دیتے ہیں جو ان کی نظر میں سوکھی ہیں۔ یا جن کی قوتِ نمو ختم ہو چکی ہے دراصل انہیں باغبانی کا منصب یاد آتا ہے:

''باغبان آتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ پودوں کے پتے مرجھانے لگے ہیں، شاخیں بھی خشک ہو چلی ہیں۔ وہ ایک قینچی لاتا ہے اور پتیوں اور شاخوں کو بے دردی سے کاٹ چھانٹ کرنے لگتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں شاید پودے بھی سمجھتے ہوں گے کہ باغباں نہایت بے درد ہے۔ بے قصور پودوں کی حسین ڈالوں کو کاٹ کر اسے خوشی ہوتی ہے۔ جو پودے ابھی کسی خوشی سے پھیلے ہوئے تھے اب لنڈ منڈ شرمندہ اپنی بدنمائی پر شرمندہ کھڑے ہیں یا پھر باغباں کی بے دردی کی شکایت کیسے نہ ہو۔''

کلیم صاحب کی اس بات کو اگر کھلے دل سے تسلیم کر لیا جائے تو ساری شکایتیں

رفع ہو جائیں گی اور ان کی ہمدردی پر اعتماد بحال ہو جائے گا۔ کلیم صاحب کا یہی تنقیدی نقطۂ نظر ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اردو زبان انگریزی اور فرانسیسی زبان کے مقابلے میں نئی زبان ہے۔ اس لئے اس زبان و ادب پر اس کے اثرات ہر چہار طرف پھیل رہے ہیں۔ یہ زبانیں کچھ اتنی زیادہ ترقی یافتہ اور ساتھ ہی ساتھ ہر لحہ انقلاب انگیز ہیں کہ ان کے اثرات کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ حالاں کہ اردو کی پیدائش عربی و فارسی زبان کے زیر اثر ہوئی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی جو زبان مغربی زبانوں کے اثرات کو تیزی سے قبول کر رہی ہے اس زبان کے پڑھنے والے اتنی ہی زیادہ تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ اس لئے اردو والوں کے اندر بھی ترقی کرنے کا صحیح احساس پیدا ہونا چاہئے۔ کلیم صاحب نے جو یہ انداز نظر اختیار کیا ہے۔ یہ اردو والوں کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن حیرت ہے سرمایہ داران ادب پر کہ وہ اس قدر چراغ پا ہو گئے۔ یہی بات تو سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے بھی کہی تھی ؎

شعر اور ادب کا یہ ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے بھی ہے بڑھ کر
قیامت کے دن بخشے جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

اس بات پر ویسا شور غوغا بلند نہیں ہوا جیسا کلیم صاحب کی اس بات پر ہوا کہ اردو میں تنقید کا وجود معشوق کی موہوم کمر ہے یا اقلیدس کا خیالی نکتہ۔ یا پھر حالیؔ پر ان کا یہ تبصرہ کہ:

"خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کل کائنات"۔

اس قدر چراغ پائی کا سبب کیوں بنا؟ شاید اس لئے کہ کلیم صاحب کی زبان کھردری ہے۔ لاگ لپیٹ سے وہ گریزاں رہتے ہیں۔ تنقید کو صاف گوئی اور صاف بیانی کی صفت سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں۔ ادبی گروہ بندیوں سے الگ تھلگ انہوں نے اپنی

دنیا آپ پیدا کرنے کا اصول اپنایا ہے۔

اس خود اعتمادی اور خودگری کا سبب شاید یہ بھی ہوگا کہ انہوں نے اس زمانہ کے ادبی اجارہ دار گروہ پر سخت تنقید کی تھی جو خود کو ترقی پسند اور بقیہ تمام لوگوں کو رجعت پسند کہا کرتا تھا۔ کلیم صاحب کا خیال یہ تھا کہ ادب اور تنقید کو محض سیاسی پروپگنڈہ بنانے سے پرہیز کیا جانا چاہئے۔ مخالفت کا سبب جو بھی ہو یہ بات مسلم ہے کہ کلیم صاحب کی مخالفت کی گئی۔ کلیم صاحب کے معائب زیادہ اجاگر کئے گئے اور محاسن پر کم توجہ دی گئی۔ اس لئے کلیم صاحب کی ناقدانہ حیثیت کا جائزہ لینا اوران کی تنقیدی خدمات کا محاکمہ کرنا ایک ضروری کام ہے جسے کیا جانا چاہئے۔

کلیم الدین احمد نے اپنے لئے جو لائحہ عمل طئے کیا اسے ہی اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی سنگ میل اور نشان راہ بنانے کی کوشش کی۔ کلیم کا مطالعہ عمیق اور ہمہ گیر تھا۔ اردو تنقید کی جڑ تلاش کرتے کرتے وہ پرانے تذکروں تک پہنچے اور اس باغ تنقید کے بار آور درخت کے طور پر انہوں نے ترقی پسند تنقید نگاروں کے سرمایۂ ادب پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی۔ انہیں ہر جگہ ایک خلاء کا احساس ہوا اور یہ احساس ہمیشہ ان کے ساتھ لگا رہا۔ کلیم الدین احمد نے جس ادنیٰ کاوش پر بھی نگاہ ڈالی اس کی گہرائی تک اترتے چلے گئے۔ ان کی اس کوشش کو ان کی ریزہ چینی اور بال کی کھال نکالنے کی کوشش کا نام دیا گیا۔ حالانکہ اسے ژرف بینی بھی کہا جاسکتا تھا۔ اس لئے کہ ان کی یہی ژرف بینی اور دور بینی اردو کے تمام تنقید نگاروں میں انہیں ممیز وممتاز مقام دلانے والی صفت کہی جاسکتی ہے۔ اس معاملہ میں ان کے قبل تو کجا ان کے زمانہ تک بھی دوسرا تنقید نگار پیدا نہیں ہوسکا ۔ ع

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

پروفیسر عبدالمغنی کو یہ شکایت ہے کہ:

”جناب کلیم الدین احمد کے طرز تنقید کا ایک زبردست عیب خردہ گیری ہے جو اکثر بے جا نکتہ چینی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔“

لیکن مجھے اس پر اصرار ہے کہ یہ کلیم کی نکتہ چینی نہیں نکتہ سنجی ہے۔ کلیم صاحب نے اردو تنقید کے جس سرمایہ پر نگاہ کی اس کے اندر جو زبردست خرابی نظر آتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ لوگ حرف برہنہ گفتن کا شیوہ اختیار نہیں کرتے ہیں۔ چلی پھرتی باتیں، گول مٹول انداز میں کہہ جاتے ہیں۔ اس وقت تو کیا آج بھی بہت سارے مشہور تنقید نگاروں کے مقالے جو مختلف ادبی پرچوں کی زینت بنا کرتے ہیں بلکہ بہتیرے حضرات تو اس طرح کی تنقید لکھنے کی لئے خطیر رقمیں بھی وصول کرتے ہیں ان کی نگارشات کا مطالعہ کیجئے تو کسی فیصلہ تک پہنچنے میں آپ سخت الجھن محسوس کریں گے۔ مقالہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے، اس کے لئے دلائل اور شواہد کیا ہیں، اگر ان کی تلاش کی جائے تو وہ گدھے کی سینگ کی طرح غائب نظر آئیں گے۔ اس کے برخلاف مغربی تنقید نگاروں کا حال یہ ہے کہ وہ کسی مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے زبان کے نہاں خانہ میں زینہ بہ زینہ اترتے ہیں اور گوہرِ مراد تلاش کرتے ہیں۔ یہ وہ بات ہے کہ جس سے تحریر میں ہمہ جہتی اور ہمہ گیری پیدا ہوتی ہے۔ کلیم صاحب کا مشورہ یہ ہے:

> ”اردو والوں کو انگریزی والوں کی اس خصوصیت کو اختیار کرنا چاہئے
> کہ اس سے دروں بینی کا ہنر آیگا ورنہ سارے کے سارے لوگ
> چراغ رہگذر بن کر رہ جائیں گے۔“

کلیم صاحب کو یہ شکایت حالؔی سے بھی ہوئی اور یہی شکایت احتشامؔ حسین، آل احمد سرورؔ اور رشید احمد صدیقیؔ سے بھی رہ گئی:

> ”حالؔی خیالات تو اخذ کر لیتے ہیں لیکن ان پر غور و فکر نہیں کرتے۔ ان
> کی جانچ پڑتال نہیں کرتے۔“

> ”احتشام حسین کی انفرادی خصوصیت یہ ہے وہ دونوں (ادب
> واخلاق) کو چھیڑتے ہیں۔ لیکن ان پر کافی روشنی نہیں
> ڈالتے۔ مسئلوں کو الجھاتے ہیں، سلجھاتے نہیں، بحث کرتے ہیں لیکن
> کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔“

حالؔی اور احتشام حسین کی طرح جب وہ آل احمد سرورؔ کی تنقیدی کاوشوں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی انہیں یہی سب کچھ نظر آتا ہے:

”سرورؔ صاحب مغربی نقادوں سے استفادہ کرتے ہیں یہ اچھی بات ہے شرم کی بات نہیں۔ وہ کبھی ایسے نقادوں کا نام بھی لے لیتے ہیں اور کبھی نہیں لیتے ہیں۔ ان کی باتوں کو عبارت سے الگ نکال لیتے ہیں۔ انہیں اپنے کام میں لاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی بری بات نہیں۔ ان باتوں میں اپنے معنی پروتے ہیں۔ ان میں توڑ مروڑ کرتے ہیں۔ اس میں بھی کچھ مضائقہ نہ تھا اگر وہ کوئی نیا نقطہ نظر پیش کرتے۔ کبھی وہ ان باتوں کو آدھا سمجھتے ہیں اور کبھی نہیں سمجھتے ہیں۔“

دراصل یہ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل والی بات ہوگئی۔ ہمارے تنقید نگار وسیع المطالعہ ہونا پسند نہیں کرتے۔ کلیم صاحب کو اس سے سخت الجھن ہوتی ہے۔

یہ صورت حال صرف تنقید نگاروں ہی تک محدود نہیں۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں کا بھی یہی حال ہے۔ فن داستان گوئی کے ”بس ایک بات“ میں انہوں نے کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

”مختصر افسانوں پر بھی ابھی تک کوئی اچھی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ ایک ایسی کتاب کی فوری ضرورت ہے جو اردو افسانوں کا انصاف کے ساتھ لیکن سخت جائزہ لے۔ ان افسانوں کی ناموزوں اور مہمل زیادتی نے طوفان نوح کی صورت اختیار کرلی ہے۔ سلامتی کی صورت ایک تو یہ ہے کہ ہم کوئی کشتی نوح بنا کر اس میں پناہ گزیں ہو جائیں۔ یا پھر اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی جائے اور اسے روک کر اس کی طاقت سے کچھ اچھا مصرف لیا جائے۔ یہ افسانے نہایت مضر ہیں۔ پڑھنے والوں کا مذاق ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتا ہے۔

ان کا دل کسی مفید اور قیمتی ادبی کارنامہ میں نہیں لگتا۔ وہ ان مہمل افسانوں کو حاصل ادب سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لئے ایسی تنقید کی فوری ضرورت ہے جو ان مہمل افسانوں کی مہملیت کو روشن کرے اور جو پڑھنے والوں کے بگڑے ہوئے مذاق کو سدھارے۔"

تنقید اور افسانوی ادب کے علاوہ اردو کا جو سب سے بڑا سرمایہ ہے وہ شاعری ہے وہاں بھی انہیں بہترین شاعری کی تلاش ہے۔ اس کے لئے ان کی رہنمائی میتھو آرنلڈ نے کی ہے:

"....بہترین شاعری.... ہمیں جستجو ہے تو اس کی..... بہترین شاعری میں ایک اعجاز ہے۔ جس سے ہماری دنیا بنتی ہے جو ہمارا سہارا بھی ہے اور ہماری انبساط کا سبب بھی.... اور یہ سہارا، یہ انبساط اور کہیں میسر نہیں۔"

انبساط اور سہارا کی تلاش میں کلیم صاحب جب گلشن اردو کی سیر کو نکلے تو انہیں شکستہ پائی نصیب ہوئی۔ مایوسیوں نے ان کا استقبال کیا اس لئے انہوں نے پوری اردو شاعری کو کم معیار قرار دیا۔ گرچہ انہیں اپنی رہبری کا زعم نہیں۔ اپنی باتوں کو وہ حرف آخر نہیں قرار دیتے۔ بلکہ دلسوزی کے ساتھ یہ ضرور کہتے ہیں:

"اس کتاب اور دوسری کتابوں میں بھی...... میرا انداز نظر سارے زمانے جدا نہیں ہے...... لیکن اس کے ماننے اور نہ ماننے کا آپ کو پورا پورا اختیار ہے۔"

اس کا انداز نظر سارے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

اردو شاعری سے انہیں سب سے بڑی شکایت یہی رہی کہ وہ غزل کے دائرہ سے باہر نہ نکل سکی۔

''اگر غزل گو شعراء نظیرؔ کی قدر و قیمت سمجھتے اور نظیرؔ کو میر کارواں بناتے تو آج اردو شاعری اور اردو غزل اپنی پستی سے نکل کر بہت بلند مقام پر ہوتی۔''

کلیم صاحب کے نظریہ میں ایک عجیب سی طُرفگی پائی جاتی ہے۔ اس طُرفگی نے تقریباً تمام تنقید نگاروں کو الجھا دیا ہے۔ عبدالمغنی جیسے سلجھے ہوئے نقاد نے بھی کلیم کے بارے میں جو رائے زنی کی ہے تو وہ بھی الجھن کا شکار ہو گئے ہیں۔ البتہ وہ تنہا آدمی اس وقت تک ہمیں نظر آتے ہیں کہ جنہوں نے کلیم کو بالاستیعاب پڑھا ہے۔ مغنی رقم طراز ہیں:

''بہ حیثیت مجموعی کلیم الدین احمد اچھے نقاد ہی نہیں بلکہ بہت بڑے نقاد ہیں انہوں نے ہمارے ادب میں کچھ معرکتہ الآراء مسائل اٹھائے ہیں۔ اردو شاعری اور تنقید پر وثوق کے ساتھ بنیادی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کچھ نظریاتی مباحث چھیڑے ہیں اور اصولی باتیں منطقی و تجزیاتی انداز میں کہی ہیں''۔

''کلیم الدین احمد کا دوسرا اہم ترین کارنامہ جس کو انہوں نے بلا شرکت غیرے انجام دیا وہ ہے اردو ادب کو نام نہاد ترقی پسندوں کی وبا سے محفوظ کر دینا ہے۔ جس علمی جرأت اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ انہوں نے اس تحریک کی حقیقت واضح کی ہے اس کے لئے وہ عام اردو دانوں سے زیادہ ان اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں جو یا تو اس دام فریب میں مبتلا ہو گئے۔ یا سب کچھ جانتے ہوئے مجرمانہ مصلحت اور سکوت کو اختیار کیا، اس بروقت انتباہ کے لئے خود ترقی پسندوں کو بھی کلیم صاحب کا ممنون ہونا چاہئے۔ آج ان کے خیالات میں احتیاط اور توازن کا جو رنگ ہے اس پر کلیم صاحب کا شعوری یا غیر شعوری اثر ضرور ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ واقعہ یادگار

رہے گا کہ ایک فرد واحد ایک سیلاب بلا کے سامنے بند بن کر کھڑا ہو گیا اور اس کو آگے بڑھنے سے روک دیا''۔

''تیسری قابل ذکر چیز جناب کلیم الدین کا مخصوص تجزیاتی اسلوب ہے۔ جو محکم، قطعی جملوں اور فقروں، تفصیلی حوالوں اور مثالوں پر مبنی ہے۔ اور جس سے مطالب کی سائنسی ریاضیائی تعین عمل میں آتی ہے۔ اس میں الفاظ کا جادو بالکل نہیں ہوتا۔ صرف معانی کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ طرز ٹھوس علمی بیانات کے لئے بہت چست پیرایہ ہے۔ اس کے سبب تبصروں میں رائے کے بجائے دلیل پر زور ہوتا ہے۔ علمی تنقید کے لئے یہ دوٹوک اسلوب بہت کارگر ہے۔''

ان تین اقتباسات کے مطالعہ سے یہ صاف جھلکتا ہے کہ عبدالمغنی نے کلیم الدین کے انداز نظر اور طرز نگارش دونوں کی تائید وتوصیف کی ہے۔ لیکن اس توصیف کے بعد انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''انہوں نے تنقید پر ایک نظر میں اکثر سینٹس بری ہی کی طرح انشا پردازی کی ہے، فقرے کسے ہیں، پھبتیاں اڑائی ہیں، طعن وتمسخر اور جملہ بازوں سے کام لیا ہے ..... اس کھلنڈرے پن میں وہ سینٹس بری سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ ان کے اندر وہ خوش اخلاقی نہیں جو سینٹس بری کی تنقیدوں کو ہجو وطنز بننے سے بچا لیتی ہے اور ظرافت تک ہی محدود رکھتی ہے۔ خوش طبعی اچھی چیز ہے لیکن اس قسم کی ہاتھیوں جیسی خوش فعلی جس کا طعنہ جناب کلیم الدین احمد نے احتشام صاحب کو دیا ہے ظاہر ہے کہ قطعی غیر سنجیدہ حرکت ہے۔''

راقم الحروف کے نزدیک یہی کلیم صاحب کی طُرفگی ہے جس کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے۔ گرچہ مغنی صاحب کو کلیم صاحب کی تنقید کے سارے پہلو پسند نہیں اور یہ

ضروری بھی نہیں کہ ہر پہلو ہر کسی کے لئے پسندیدہ ہو۔اس لئے مغنی صاحب نے اخیر میں لکھا ہے کہ:

''انہوں نے پہلی بار اردو میں عملی تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں جس کے پیچھے کارفرما نظریئے سے اختلاف ممکن ہے مگر جس کے منطقی وتجزیاتی، مربوط ومرتب انداز کار کا قائل ہونا ہی پڑے گا''۔

اسی لئے یہ کہنا مبنی پر حقیقت ہے کہ:

''وہ اردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں لیکن اردو تنقید کے مسیحا وہ بہر حال نہیں۔جس نقاد کی اردو دنیا منتظر ہے وہ کلیم الدین احمد نہیں۔''

اور یہ بھی نہیں کہتا کہ کلیم صاحب صاحب اردو تنقید کے مسیحا ہیں لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ کلیم صاحب اردو کے قاتل بھی نہیں۔وہ تو ایک جراح ہیں جنہوں نے اردو کے فصد کھولی ہے اور اردو ادب کے جسم کے اندر جو فاسد مواد جمع ہوگیا تھا اور ہو رہا تھا اسے باہر لاکر اس کا پیتھولوجیکل ٹسٹ کرنے اور کرانے کی دعوت دی ہے۔اس لئے کلیم صاحب کے نظریۂ ادب کو سمجھنے کی بہرحال ضرورت ہے۔اس سے آنے والی نسل کو رہنمائی ملے گی۔اس کا دعویٰ کلیم صاحب کا ہو یا نہ ہو میرا........احساس ہے اور میں خود کو اس پر قائم رکھنا چاہتا ہوں۔

اور تب سوکھی ہوئی ڈالیوں کی کاٹ چھانٹ کرنا،فورڈ کی پہلی موٹر کو میوزیم میں رکھنے کی تلقین کرنا، ہنگامی اور تاریخی سمجھنا اور کہنا، لازوال فنی خوبیوں کو باقی رہنے والے نظریوں اور اصولوں کو تنقید کی نہ بجھنے والی مشعل کی روشنی میں دیکھنا، بیدردی نہیں ہمدردی ہے اور یہی تنقید کا جوہر بھی ہے۔ بلاشبہ کلیم صاحب تنقید کے جوہر سے واقف بھی ہیں اور اردو زبان کے ہمدرد بھی ہیں۔ان کی اس محبت اور ان کے اس جوہر کو اردو کا طالب علم کبھی فراموش نہیں کرسکتا ہے۔

☆☆☆

اختر اورینوی

(بحیثیت اعتدال پسند تنقید نگار)

ادب کو علاقوں، جماعتوں اور خانوں میں تقسیم کرنا اس نقطۂ نظر سے ایک ناپسندیدہ عمل ہے کہ ادب ایک مکمل وجود رکھتا ہے۔ اس کے ٹکڑے پرزے کرنا، اس کے خوبصورت پیکر کو الگ الگ کرنا ہے۔ کسی کی آنکھیں بے حد خوبصورت ہوسکتی ہیں تو کسی کے لب ورخسار۔ کسی کا حسن اس کی زلفوں میں اسیر ہوسکتا ہے تو کسی کا اس کی چال میں، اگر کسی کی خوبصورت آنکھیں نکال لی جائیں یا زلفیں تراش لی جائیں کہ یہ حصہ ہمیں بہت پسند ہے۔ اسی طرح کسی خوش قامت کی خوشروی پر فریفتہ ہوکر اس کی ٹانگیں کاٹ لی جائیں تو یہ فعل کسی بھی حال میں درست تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

البتہ یہ تو ہوہی سکتا ہے کہ جو شخص کسی کی آنکھ پرواری ہو اس کی آنکھوں کا تذکرہ مجرد طور پر کرے اور کوئی کسی کی زلفوں کا ذکر چھیڑ بیٹھے۔ ٹھیک اسی طرح اگر ادب کا مطالعہ کرنے کے وقت ایک طالب علم یہ کہے کہ فلاں شخص فلاں علاقے کا ہے وہ اپنے اندر علمی مرتبہ رکھتا ہے پھر بھی اہل علم اس کی پذیرائی نہیں کرتے ہیں۔ یہ اہل علم کی حرکت مذمومہ ہے۔ اس لئے کسی کو اس کے لئے نہ تو چراغ پا ہونے کی ضرورت ہے اور نہ طوفان کھڑا کرنے کی:

> ''اہل بہار کو شکایت ہے اور بجا شکایت ہے کہ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے ان تمام تذکرہ نویسوں، مورخوں اور نقادوں نے جو بیرون بہار کے ہیں اس دبستان ادب سے بے اعتنائی برتی ہے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر بہتیرے مصنفین یہاں کے مشاہیر کا شمار اپنی

تصنیفوں میں نہیں کرتے اور جو ذکر یہاں کے سر برآوردہ شعراء اور
ادباء کا ملتا بھی ہے وہ اتنا غیر اہم نظر آتا ہے کہ حق اور انصاف کی
کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔'' (ڈاکٹر نجم الہدی)

یہ شکایت عام ہے اور اس میں وزن بھی ہے، اردو ادب کے ابتدائی دور کی بات ہو یا اس کی ترقی کے مختلف مراحل کی۔ ہر زمانہ میں بہار کے شعراء اور ادباء نے اردو زبان و ادب کی خدمت میں برابری کی حصہ داری رکھی ہے۔ جب اردو تنقید کا آغاز ہوا تو حالیؔ اور شبلیؔ کی طرح نواب امداد امام اثرؔ، سید سلیمان ندویؔ اور نصیر حسین خیالؔ جیسے قلمکاروں نے اردو میں تنقید نگاری کا جوہر دکھایا۔ یہاں تک کہ یہ تنقید عہد بہ عہد ارتقائی مدارج طئے کرتی ہوئی ترقی کے اس زینے پر پہنچی جس نے تنقید کا ایک باب قائم کیا اور تنقید نگاری ایک صنف ادب کی حیثیت سے اپنا مقام متعین کرگئی اس عہد میں آل احمد سرورؔ، احتشام حسینؔ، عبادت بریلوی اور سید عبداللہؔ جیسے تنقید نگار جب سامنے آئے تو ان کے قدم بہ قدم اور بعض وقت دو قدم آگے سے آگے بڑھتا ہوا جو تنقید نگار بہار کی سرزمین پر ہمیں نظر آتا ہے اس میں کلیم الدین احمدؔ کے ساتھ ساتھ بہار کا ایک اور بھی تنقید نگار ہے جس کا مطالعہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اور یہ شخصیت ہے جناب اخترؔ اورینوی کی:

''اختر اورینوی ایک رنگا رنگ شخصیت کا نام تھا جو جہد و عمل سے اتنی
ہی دلچسپی رکھتے تھے جتنی علم و فن سے اور جسے علم و فن کے بھی بہتیرے
شعبوں میں درک تھا''۔ (ڈاکٹر عبدالمغنی)

اخترؔ اورینوی نے افسانہ، ناول، ڈرامہ، شاعری، تحقیق اور تنقید سبھی میدانوں میں اپنے کمال کا جوہر دکھایا، وہ عہد حاضر کے جانے اور مانے ہوئے نقادوں میں سے ایک ہیں۔ ذی وقار اور منفرد، ان کی تنقید سائینٹیفک ہوتی ہے۔ مگر انہوں نے کسی مخصوص نظریۂ حیات سے اپنے آپ کو وابستہ رکھنا پسند نہیں کیا۔ احتشام حسینؔ کے بقول:

''انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں اور افسانے بھی، شاعری بھی کی ہے

اور ڈرامے کی بھی تخلیق کی ہے۔ وہ تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے
ہیں اور تخلیق کی راہوں سے بھی گذرتے رہے ہیں۔ قابل غور بات
یہ ہے کہ انہوں نے ان سب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے
ہیں..... ان کی علمی صلاحیتوں کے اعلیٰ ترین مظاہر ان کے افسانے
اور تنقید مضامین قرار پائے ہیں"۔

اس حقیقت کا اعتراف ڈاکٹر عبدالمغنی نے بھی کیا ہے۔ بہر حال ان کی خدمات کا بیشتر حصہ اور بہتر حصہ دو اصناف ادب میں پایا جاتا ہے ان میں ایک افسانہ ہے اور دوسری تنقید۔ جس طرح وہ اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ چار بڑوں میں شامل تھے اسی طرح تنقید میں وہ آل احمد سرور کلیم الدین احمد اور احتشام حسین کے ساتھ مل کر ارکان اربعہ کی تشکیل کرتے ہیں۔

ان کے تنقیدی کے مضامین کے کل چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "کسوٹی، تنقید جدید، تحقیق وتنقید، قدر ونظر، سراج ومنہاج اور مطالعہ ومحاسبہ"۔ ان کے علاوہ اسی نوع کی دو اور کتابیں بھی ہیں جن کا مطالعہ ان کی تنقیدی صلاحیت اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے کیا جانا چاہئے۔ یہ کتابیں ہیں "مطالعہ اقبال اور بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء"۔ ان تمام کتابوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے موضوعات بہت وسیع اور رنگارنگ ہیں:

"قدیم وجدید نثر ونظم اور نظریاتی وعملی مسائل جو علمی اور ادبی نوعیت
کے تھے ان پر انہوں نے اظہار خیال کیا ہے اور ایک رائے قائم کی
ہے یہ اختر اورینوی کے ذہن کی ہمہ جہتی کا ثبوت ہے۔ وہ زندگی،
ادب اور تنقید کے باہمی رشتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس
لئے ان کی تنقید میں حیات کی توانائی ادب کی صحت مندی اور تنقید کی
گراں مائیگی کا امتزاج ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ .... ان کی تنقیدی
تحریروں میں حیات انسانی کے مختلف شعبہ جات کے علوم کی کارفرمائی

نظر آتی ہے... عمرانیات و مدنیات، بشریات، تاریخ، فلسفہ، نفسیات
اور کبھی کبھی طبعی علوم کا سہارا لے کر انہوں نے اپنے تنقیدی زاویوں کو
اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ (نجم الہدیٰ)

جب ان کے تنقیدی زاویوں کا ذکر درمیان میں آ گیا ہے تو ہم یہ چاہیں گے کہ ان کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے پہلے ہم ان کے زاویہ نظر پر کچھ باتیں کر لیں۔ اختر صاحب نے اپنے نظریہ فن کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:

"تنقید تخلیقی قوت، مذاق سلیم ذوق و شوق اور قدرت اظہار کا نام ہے۔ فن کے اندر فکر کا پایا جانا بھی ضروری ہے جذبۂ تحقیق کی قدر و قیمت فکر سے بڑھ جاتی ہے اور فکر فلسفہ و فن کو وزن اور وقار عطا کرتے ہیں۔"

اس نکتہ کی توضیح انہوں نے مختلف انداز میں تفصیل کے ساتھ کئی جگہ پیش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"ہم ابن آدم، بہر حال مقصد اور معنی کی تلاش میں بے چین رہتے ہیں اور اگر ہم اپنے چاروں طرف مقصد اور معنی پاتے ہیں تو ان کی تمنا کرتے ہیں اور ان کی تخلیق کے لئے کوشاں ہو جاتے ہیں...... ہر فرد کی داخلی زندگی ایک عالم صغیر ہے اور اس عالم صغیر میں عالم کبیر، کائنات و فطرت کی مختلف ترو تیج و تصویریں ہوتی ہیں۔ فرد فرد کے ذہن و ذوق میں فرق ہوتا ہے۔ اسی اختلاف میں اس کے نظریہ میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ کا کوئی ذکی اور دانشور فرد، ان امور پر سوچتا ہے اور وہ معنی اور مقصد کی تلاش میں دور تک جاتا ہے ہمہ جہتی طور پر اپنی جستجو اور نمودِ فکر کو جاری رکھتا ہے اور دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بالیدہ، واضح اور مربوط نظریۂ حیات اور

کائنات پیش کر دیتا ہے۔ بہت سارے لوگ اس کی پیروی کرنے
لگتے ہیں اور ایک دبستان فکر پیدا ہو جاتا ہے۔"

ان صراحات کے بعد انہوں نے یہ بھی لکھا ہے:

"ان کا میلان حقیقت پسندی، مقصدیت، وسیع و بنیادی جمہوری اور
اخلاقی اشتراکیت کی طرف ہے، لیکن پھر بھی نہ وہ ترقی پسند ہیں اور
نہ ترقی پسندی کو اپناتے ہیں۔"

اختر صاحب ادب میں عمومیت، جمہوریت، وسیع البنیادی، ناوابستگی اور غیر جانبداری کے قائل تھے۔ ان کا خیال کسی مخصوص نظریہ کا حامل نہیں تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مخصوص نظریہ سے وابستہ ہو جانے کے بعد ادب محدودیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سے ادب کو جتنا فائدہ پہونچتا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کا نقصان ہو جاتا ہے۔ آدمی کی نظر سطحی اور محدود ہو جاتی ہے۔ وہ صرف اس وجہ سے کسی اچھائی کو قبول نہیں کرتا کہ زیر بحث فن کسی مخصوص نظریہ کا حامل نہیں۔ اسی طرح سے وہ مخصوص نظریہ کے حامل فن کار کی تمام خامیوں اور خرابیوں سے چشم پوشی کر جاتا ہے۔ اختر صاحب نے اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

"ادب میں ایک مارکسی کی بھی جگہ ہے اور مسلم کی بھی، رند کی بھی اور
متقی کی بھی، ایک ہندو اور گبرو کی بھی، ایک عیسائی اور یہودی کی بھی
اور ایک ایسے شخص کی بھی جو کچھ نہ ہو۔ نرا آزاد خیال اور خاص نیچرل
ہو، وہ سوچتا ہو اور سوچ وچار کر آدمی نتیجہ پر بھی پہنچ سکتا ہے کہ زندگی
اور ادب میں کسی نظریہ کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ایک نظریہ ہے۔
بشرطیکہ وہ پروردۂ فکر ہو۔"

اس طرح اختر صاحب نے کسی نظریہ سے وابستہ ہونے سے فنکار کو روکنا چاہا ہے اور یہ تجویز پیش کی ہے کہ فن کار کو چاہئے کہ مختلف نظریات کا مطالعہ کرے اور جہاں جہاں، جس جس سطح کی اچھائیاں اسے ملیں وہ ان اچھائیوں کو قبول کرتا چلا جائے۔ مخصوص نظریات

سے وابستہ لوگوں کے لئے یہ بات ایک عجوبہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اپنے آپ میں یہ ایک بڑی بات ہے۔ اس طرح اچھائیوں کی تلاش سے دنیا میں اچھائیاں پھیلیں گی۔ حسن فروغ پائے گا اور دنیا دلکشی اور دلچسپی سے بھر جائے گی۔ دراصل یہی وہ نظریہ ہے جسے ہم تعمیر پسند نظریہ کا نام دے سکتے ہیں۔

اختر صاحب نے حسن کو اولیت دی ہے۔ احتشام حسین نے اختر صاحب کے اس نظریہ تنقید کے متعلق ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ان کے نزدیک اختر اور رینوی کے ذہنی عمل کو ہم حسن خیز حقیقت کی جستجو کا سنگم کہہ سکتے ہیں۔ اس حسن پسندی کے متعلق اختر صاحب نے فرمایا ہے کہ:

> ''فن کار کی ترقی پسندی یہی ہے کہ وہ کسی کا غلام نہ ہو، نہ جاگیرداروں، نہ سرمایہ داروں، نہ آمروں کا، نہ استحصالیوں کا، وہ ایماندارانہ زندگی، معاشرہ، فطرت اور کائنات کے متعلق اپنے ردعمل کو پیش کرے اور اس پیش کش میں جمالیاتی اقدار کو اپنا رہبر بنائے۔ وہ تنقید اور تردید میں اپنے ایمان، اخلاق، جرأت اور اپنی حسن کاری کی روشنی میں آگے بڑھے، وہ اپنے نصب العین کی پرورش اپنے لہو سے کرے۔ وہ حقیقتوں کو بھی پیش کرے، خوابوں کو بھی۔ وہ ایک بہتر سماج کی تشکیل کے لئے بھی کوشاں ہو۔ میں بڑے مطمئن قلب کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جنت فن نام ہے حسن کاری کا، گہرے مشاہدہ کا احساس، مخلص جذبات، بلند تخیل، انسانی محبت، اخوت عامہ، حرکت و عمل مساوات و حریت، قربانی و ایثار اور موجودہ دنیا سے بہتر دنیا کی تلاش کا لیکن یہ تلاش حق بغیر رواداری اور مفاہمت کے ناممکن ہے۔ میرا عقیدہ لا اکراہ فی الدین بھی ہے اور لا اکرہ فی الفن بھی''۔

اخترؔ صاحب کے متعلق ڈاکٹر نجم الہدیٰ صاحب کی یہ بات بڑی اہم ہے جس کا ذکر ہم یہاں کرنا چاہیں گے۔ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

''اخترؔ صاحب کی انفرادیت ان کے انداز تجزیہ، اسلوب کے بانکپن میں ہے۔انداز تجزیہ وہی ادب کے پس منظر کو نمایاں کرنے کا ہے اور اسلوب کا بانکپن زبان و بیان کی دلاویزی عبارت کی شگفتگی تخیل کی ندرت، پرواز سے عبارت ہے۔اخترؔ صاحب اپنے تنقیدی افکار وآراء کی وضاحت میں اکثر نادر تشبیہ و استعارہ کے استعمال سے شعریت پیدا کرتے ہیں۔یہ شعریت ان کے احساس جمال کی غماز ہے۔''

اس اقتباس سے یہ بھی گمان گذر سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اخترؔ صاحب کو جمالیاتی نقاد تسلیم کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں۔انہوں نے اخترؔ صاحب کی تنقید نگاری میں جمالیات کا غالب عنصر دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے۔لیکن وہ انہیں اصلاً ایک سائیٹفک تنقید نگار ہی سمجھتے ہیں۔اس لئے کہ ان کا تنقیدی شعور علم وفن اور شعروادب کے تمام گوشوں پر بھرپور گرفت رکھتا ہے۔ڈاکٹر عبادتؔ بریلوی نے بھی اخترؔ صاحب کی تنقید کے متعلق بھی کچھ اسی قسم کی بات کہی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ:

''اخترؔ صاحب ادب کو اجتماعی اور سماجی زندگی کی پیداوار تو سمجھتے ہیں لیکن وہ اشتراکی نظریہ کے قائل نہیں ہیں۔ان کے نظریات کے سائیٹفک ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اس لئے کہ وہ عقل وشعور کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے۔وہ کسی موضوع پر بحث کرنے سے پہلے اس کے ماحول اور اس کی وارثت کا جائزہ لیتے ہیں۔پھر اس ادبی ماحول اور ذہنی ساخت کے اثرات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔تہذیب اور کلچر کے اثرات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ان کی فنی

خوبیوں کا بھی پتہ لگاتے ہیں۔ ڈاکٹر اخترؔ اورینوی کا ذہن ہمہ جہت
ہے۔ ان کے موضوعات وسیع اور رنگارنگ ہیں۔ قدیم و جدید، نثر و
نظم اور نظریاتی و عملی ہر قسم کے ادبی مسائل پر انہوں نے اظہار خیال
کیا ہے۔''

ڈاکٹر عبدالمغنی اخترؔ صاحب کو جمالیات پسند اور اخلاقیات پسند دونوں تسلیم کرتے
ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ:

''انہوں نے نہ صرف یہ کہ جدید اردو تنقید میں جمالیات کے ساتھ
اخلاقیات کی گم شدہ کڑی کو دریافت کر کے پیوستہ کیا بلکہ مبہم
اخلاقیات کی بھول بھلیاں سے نکل کر دانشورانہ محکمی کے ساتھ
دینیات کی شکل میں اخلاقیات، متعین ضابطہ اور واضح نظریہ کا سراغ
لگایا اور اس طرح انہوں نے تنقید کو اس سمت میں آگے
بڑھایا..... اخترؔ اورینوی شخصیت کے لحاظ سے شبلیؔ سے قریب تھے
لیکن انہوں اپنی تنقید میں شبلیؔ اور حالیؔ دونوں کی جمالیات اور
اخلاقیات کو یکجا اور یکجہت کر کے پیش کیا۔ اخترؔ صاحب کی خوبی یہ بھی
ہے کہ وہ مغربی ادبیات کے قدرداں تھے لیکن وہ اس سے کبھی
مرعوب نہیں ہوئے۔ وہ ایسے آفاقی ہیں جن کا دل مقامی اور علاقائی
محبت سے سرشار ہے۔ ان کی اس علاقائیت پسندی کو صوبہ سے باہر
کے لوگوں نے بہاریئے کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ اس کی
حقیقت بس اتنی ہے کہ انہوں نے اہل بہار کی خدمات اور کارناموں
کا تفصیلی جائزہ پیش کر کے اہل ادب کو یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ
مملکت ہند کا یہ خطہ علم و ادب کا مخزن اور منبع رہا ہے۔ گرچہ اس مہم میں
وہ نمایاں طور پر کامیاب نہیں ہو سکے اور ان کی مبالغہ آمیزی نے انہیں

کچھ نقصان بھی پہونچایا۔ لیکن اس کی وجہ سے ان کی علمی شخصیت متاثر نہ ہو سکی''۔

احتشام حسین نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ:

''اگر چہ انہوں نے کہیں کہیں اپنے خیالات، جذباتی انداز میں ظاہر کئے ہیں لیکن ان کے پیچھے گہری علمی بصیرت اور زبردست مطالعہ سے پیدا ہونے والا شعور ہے۔''

اس طرح مختلف تنقید نگاروں نے اختر صاحب کی فکر کی قدر شناسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی یہ قدر شناسی اس بات کی دلیل ہے کہ اختر صاحب ایک واضح اور بلند فکر کے حامل تنقید نگار تھے۔

اخیر میں ہم یہ بھی چاہیں گے کہ اختر صاحب کے اسلوب پر بھی چند باتیں کر لی جائیں۔ اس لئے کہ ان کا اسلوب بھی ایک خاص چیز ہے جن پر انشاء پردازی کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کی یہ انشاء پردازی جگہ بہ جگہ انشائیہ کی شوخ سرحد میں داخل ہو جاتی ہے۔ جس سے موضوع کی سنجیدگی کبھی کبھی متاثر ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کے اسلوب کی یہی شوخی ان کی اپنی پہچان ہے۔ ایک طرف ان کے مطالعہ کی وسعت مختلف علوم وفنون پر حاوی تھی۔ جب کہ دوسری طرف ان کی طبیعت شوخ اور رنگین تھی عبدالمغنی کے بقول:

''اور رینوی کا طرز وانداز شبلی سے قریب ہے۔ اس میں ثروت، دبازت، تہداری اور خیال انگیزی ہے۔ بعض وقت جذبۂ بے اختیار شوق اور رینوی کو نکتہ سنجی سے آگے بڑھ کر جملہ بازی پر اکساتا ہے اور کبھی اس کی معنی آفرینی شاعری تک پہنچ جاتی ہے۔''

ان تمام حقائق کے پیش نظر جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اختر صاحب کی تنقید نگاری کو کبھی کبھی ان کی جذباتیت نے اور کبھی کبھی انشاء پردازی نے ٹھیٹھ سیدھی اور دو ٹوک زبان بننے سے روک لیا ہے۔ وہ تنقید نگار جتنے اچھے تھے اتنے ہی اچھے محقق بھی تھے اور

اسی کے ہم پلہ افسانہ نگار بھی تھے۔ ساتھ ساتھ انہوں نے انشائیہ نگاری کے میدان میں بھی اپنا جوہر دکھایا۔ زیر تربیت طلبائے ادب کو شستہ، بامحاورہ اور رنگین زبان بنانے کی نیت سے وہ ایک معیاری اور خوبصورت زبان کا استعمال روزمرہ میں کرتے رہے۔ اس لئے انہیں اس کا شاید خیال بھی نہ رہا کہ تنقید کے لئے وہ ایک الگ پاٹ دار زبان استعمال کریں۔ جبکہ کلیم الدین احمد، ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر عبدالمغنی جیسے تنقیدوں نگاروں نے خالص تنقید لکھنے کا کام ہمیشہ کیا اس لئے ان کی زبان تنقید کی زبان بن کر رہی۔ اختر اورینوی اگر اس پر توجہ دیتے تو ان کے جیسے صاحب علم اور واقف زبان کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مختلف اصناف ادب کے میدانوں میں اپنا جوہر دکھانے والے اس فنکار کو ہفت قلم ہونا تھا۔ سو وہ نہیں ہو سکے لیکن صاحب قلم تو بہر حال بن کر رہے اور اپنا لوہا منوا کر چھوڑا۔ میں اپنی بات ڈاکٹر عبدالمغنی کے اس اقتباس پر ختم کرنا چاہوں گا جو اختر صاحب کے لئے حرف معتبر کا درجہ رکھتا ہے:

> ’’اختر اورینوی اردو تنقید کے ان معماروں میں ہیں جنہوں نے حالی وشبلی کی ابتدائی اور مشرقی انداز کی تنقیدوں کے بعد عبدالحق کی تخلیقی اور رشید احمد صدیقی کی انشاء پردازی سے آگے بڑھ کر جدید مغربی انداز کی خالص اور مکمل تنقید کی تشکیل کی ہے۔ اورینوی کا دور جدید اردو تنقید کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے جس کے نمایاں لکھنے والوں میں مجنوں گورکھپوری، وقار عظیم اور محمد حسن عسکری کے علاوہ آل احمد سرور، کلیم الدین احمد احتشام حسین اور خود اختر اورینوی ہیں۔‘‘

☆☆☆

اختؔر قادری کی غزل گوئی

"غزل ایک کافر صنف سخن ہے، غزل اردو شاعری کی آبرو ہے، غزل تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اور چاول پر قل ھو اللہ لکھنے کا فن ہے۔"

یہ اور اسی قسم کے بہترے جملے اور فقرے غزل کی موافقت اور مخالفت میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کا انفرادی طور پر تجزیہ کرنا اور تردید و تائید کی کوشش کرنا ایک تفصیل طلب مرحلہ ہے۔ پھر بھی ان کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ سبھی جملے اپنے پیچھے معنویت کا ایک دفتر رکھتے ہیں کیونکہ غزل کی بنیادی خصوصیتیں ان کے اندر یکجا کردی گئی ہیں۔ غزل میں ایک انداز دلربائی ہے۔ اس طرز دلبری نے ہر زمانے میں بلا امتیاز مراتب قاری کا دامن دل اپنی طرف کھینچا ہے۔ اس کے اس دلکش انداز کی وجہ اس کا جمالیاتی عنصر ہے۔ غزل کا بنیادی مسلک عشقیہ جذبات و کوائف کی مرقع کشی ہے۔ خود لفظ غزل کے معنی عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں گفتگو کرنے کے ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس صنف کے ساتھ جنس لطیف کا تعلق اس کی دلکشی کو بڑھا دیتا ہے۔ لفظ غزل کے لغوی معنی سے قطع نظر۔ جن مطالب و مضامین کے لئے یہ صنف برتی جاتی ہے وہ اس کے لغوی معنی کے علاوہ، زندگی کے تنوع کا احساس اس کی ترجمانی، فلسفہ کی گہرائی و گیرائی ،سماجی اور معاشرتی عنصر، تاریخی واقعات اور عمرانی نظریات کا عکس بھی اس میں نظر آتا ہے۔

غزل گوئی کا کمال تو یہ ہے کہ شاعران تمام خارجی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں اپنی داخلیت کا رنگ دے دے اور پھر اس میں ڈوب کر اپنے خیالات کا اظہار کر دے۔ وہ غمِ حیات کو غمِ ذات اور غم معشوق بنا دے۔ دراصل یہی غزل کی عظمت ہے۔ غزل

گوئی کا کمال ہے ؎

آلام روزگار کو آساں بنا دیا جو غم ملا اسے غم جاناں بنا دیا

غزل کی مقبولیت کا ایک راز، اس کے موضوعات سے داخلی ہم آہنگی پیدا کرنے کا احساس ہے اور دوسرا سب سے اہم گر، ترسیل خیال اور اسلوب بیان کا بانکپن ہے۔ غزل گو کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ کسی جذبہ کی آنچ سے پگھلتا رہے بلکہ اس کا منصب یہ ہے کہ اس کے اندر احساس جمال بھی ہو، اظہار نغمگی وموسیقی بھی، ایجاز واختصار بھی ہو اور اعجاز بیانی بھی، انتشار بھی ہو اور انضباط بھی۔ اگر غزل گو ان تمام فروعات میں کامیاب ہو گیا تو اس کی غزل کامیاب ہوگی ورنہ آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گراں کو سانس لینے سے بھی ٹھیس لگ جائے گی جس کی وجہ سے شیشہ گر کی سخت رسوائی ہوگی ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گراں کا

فن غزل کے اس مختصر جائزہ کے بعد ہم پروفیسر اختؔر قادری کی غزل گوئی کا جائزہ اسی پس منظر میں لیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ شاعر کہاں تک غزل کے مفہوم کو ادا کر سکا ہے۔ کہاں تک غزل گوئی کے فرائض سے عہدہ برا ہو سکا ہے۔ کہاں تک غزل کو غم ذات بنا سکا ہے اور کہاں تک سانس کے نشیب وفراز پر قابو رکھ سکا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اختؔر قادری ایک شاعر ہیں اور حقیقی شاعر ہیں۔ وہ غزل گو سے زیادہ نظم نگار ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ''سرودِ نو'' اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کی نظم نگاری پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اختؔر صاحب کی عظمت پر مہر توثیق ثبت کرنے والی، ان کی شاعری کو دوام بخشنے والی اور ان کو زندہ وجاوید کرنے والی، ان کی نظمیں ہی ہیں۔ لیکن سر دست ہم ان کی شاعری کے اس پہلو کو دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے یہ نظموں کی بہ نسبت زیادہ کامیاب نظر نہیں آتیں۔

لیکن اختؔر صاحب کی حیات، تصورات، خیالات اور احساسات کی ہمہ گیری کو سمونے کے لئے کسی ایسی صنف کی ضرورت تھی جو ایجاز و اختصار کے ساتھ ان کی زندگی کے طویل تجربوں، مشاہدوں اور جذبوں کو سمو کر قاری کے سامنے پیش کرتی۔ صنف غزل نے یہ حق ادا کر دیا ہے۔

یہ بات پہلے بھی زیر بحث آچکی ہے غزل میں ایجاز و اختصار کے ساتھ ساتھ انتشار بھی ہوتا ہے اور یہی انتشار اس کا حسن بھی ہے۔ گرچہ اسی انتشار کو بنیاد مان کر اکلیم الدین احمد اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دیتے ہیں۔ لیکن رنگا رنگ پھولوں کا یہ گلدستہ اپنے اندر جتنی معنویت، دلکشی جاذبیت اور حسن رکھتا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ اختؔر قادری نے غزل کے فرائض منصبی کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ اسے مکمل طور پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اپنی فنکارانہ عظمت دکھائی ہے اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

اختر کے یہاں تصوف بھی ہے اور تغزل بھی، اظہار شوق بھی ہے اور اقرار عشق بھی، پاس وفا بھی ہے اور اعلان جفا بھی، آرزوئے وصل بھی ہے اور غم ہجر بھی، گلۂ محبوب بھی ہے اور غم روزگار بھی، احساس ناقدری بھی ہے اور نشۂ سربلندی بھی، ماتم آزادی بھی ہے اور ماتم زوال انسانیت بھی، ساقی کی تعریف بھی ہے اور معشوق سے نوک جھونک بھی، انقلابیت پسندی بھی ہے، اور دنیائے دنی سے بیزاری بھی، معاملہ بندی بھی ہے اور معاملہ فہمی بھی، الغرض زندگی کا ہر گوشہ اور حیات و کائنات کا ہر شعبہ ان کے افکار و تخیل کی پہنائی میں سما گیا ہے۔ یہ ان کی شاعری کی عظمت کی دلیل ہے اور ان کی غزل گوئی کا کمال۔ آیئے اب ہم ان کی کچھ الگ الگ خصوصیات کا مجمل جائزہ لیں۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اپنے مقالہ ''اختر قادری کی شاعری'' مطبوعہ ماہنامہ شاعر بمبئی شمارہ تین ۱۹۶۲ء میں تقریباً یہ دعویٰ کیا ہے کہ اختؔر کے یہاں تغزل سے زیادہ تصوف ہے ان کے اسی دعویٰ کی تردید کرتے ہوئے میں یہ کہونگا کہ اختر صوفی شاعر نہیں ہیں۔

گرچہ ان کا مزاج مذہبی ہے۔ وہ بغیر مذہب کے کوئی لقمہ توڑنا پسند نہیں کرتے

لیکن جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے ان کی غزلوں میں تصوف سے زیادہ تغزل کا رنگ نمایاں ہے اور یہاں ان کی غزل گوئی سے ہمارا تعلق ہے اس لئے ہم انہیں ان کی غزلوں کی روشنی میں صوفی شاعر ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ تصوف ایک ایسا میدان ہے کہ جس میں ہر شاعر پا بہ جولاں رہا ہے۔ غالبؔ کے جیسا رند خراباتی بھی صوفیانہ شعر کہہ گذرا اور وہ بھی اتنا بلند پایہ کہ فلسفہ تصوف و معرفت کے موضوع پر اسی کا کلام مثال بن گیا۔ غالبؔ کی صوفیانہ شاعری ایک موضوع مطالعہ و بحث بن گئی۔ لیکن یہ شاعری غالبؔ کا امتیاز نہیں بن سکی۔ ان صوفیانہ طرز کے اشعار کی بنیاد پر غالبؔ کے اصل محاسن شاعری سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

اخترؔ قادری رند خراباتی نہ سہی، حسن پرست تو ضرور ہیں (حالانکہ ایک بار قادری صاحب نے خود فرمایا تھا کہ مگہہ کے سادات پر تاڑی کی حرمت پر وحی نازل ہوئی ہے۔ مگر یہ ایک راز کی بات ہے)۔ بہر حال حسن پرستی اخترؔ صاحب کی گھٹی میں سمائی ہوئی نظر آتی ہے۔ حسن پسندی کوئی جرم بھی نہیں ہے۔ یہ تو فطرت انسانی ہے۔ اخترؔ صاحب اگر حسن سے متاثر ہوئے، اس کی قصیدہ خوانی کی، اس کے قدموں پر اپنا سر رکھا، اسے جا بجا ڈھونڈھا، اسے بوقت شام کبھی لب بام دیکھا، کبھی نیم حجابانہ انداز میں اپنے سامنے پایا اور کبھی پردۂ مہمل میں صرف لرزش ہی ہو سکی اور اس لرزش کو دیکھ کر ہی ان کے دل میں بجلی سی کوندگئی تو یہ کوئی غیر فطری بات نہیں ہوئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وہابؔ اشرفی صاحب غایت عقیدت و احترام میں اخترؔ صاحب کو صوفی شاعر قرار دیتے ہیں یا پھر اس لئے کہ وہ بہار یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو ہیں۔ بزرگ ہیں، معمر ہیں، ہر وقت طلبا کے ساتھ پند و نصیحت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وقت کے ساتھ ان کے رجحانات بھی بدل چلے ہوں۔ لیکن اب ان کے بدلے ہوئے خیالات کی بنیاد پر انہیں محض صوفی شاعر قرار دینا حقیقت کی پردہ پوشی ہوگی۔ انہوں نے چونکہ اپنے خیالات و جذبات کو الفاظ میں قید کر دیا ہے اس لئے وہ ہمیشہ بجنسہٖ محفوظ رہیں گے اور ان کے راز ہائے دروں کو برافگندہ نقاب کرتے رہیں گے۔ کیا آتشؔ،

غالبؔ، مومنؔ، داغؔ اور اس قبیل کے دوسرے شعراء کو اب ہم عاشق سرمست نہ کہیں کہ وہ مر چکے ہیں؟

وہاب صاحب نے اخترؔ صاحب کے جن اشعار کی بنیاد پر ان کو ایک صوفی شاعر قرار دیا ہے حقیقتاً ان کی غزلوں میں اس طرح کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور بہ مقدار و افراایسے اشعار وہاں موجود ہیں جو میرے دعوئ پر دال ہیں۔ البتہ چونکہ غزل متنوع خیالات کی حامل ہوتی ہے اس لئے اخترؔ صاحب کے یہاں بھی تنوع ہے۔ اس تنوع میں صوفیانہ اشعار بھی اخترؔ صاحب کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے وقت ان صوفیانہ اشعار کا حوالہ دیا جانا بھی دیانتداری کا تقاضہ ہے اس لئے اخترؔ صاحب کے ان صوفیانہ اشعار کا حوالہ دے کر میں اپنی گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھانا چاہوں گا ۔

جانے اس جلوۂ بے پردہ کا عالم کیا ہے
سو حجابوں سے بھی جس کی یہ ضیا آتی ہے

☆

جہاں وہ جلوہ نما ہو سر نیاز جھکا
یہ قید دیر و حرم ہے مجاز بے بنیاد

☆

خراب جستجو ہے میری جان ناتواں ابتک
نہیں ملتا اس ان دیکھے صنم کا آستاں ابتک

☆

میرے فلک کے چاند ستارے کچھ اور ہیں
میں جن میں محو ہوں وہ نظارے کچھ اور ہیں

☆

بھرم کھل جائے عالم پر کسی کی لا مکانی کا
غنیمت ہے حریم دل نگاہوں سے نہاں ٹھہرا

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اختر صاحب مذہبی مزاج کے آدمی ہیں۔ مذہب کا ان پر شدید غلبہ ہے۔ ان اشعار کی تحریر کا محرک ان کا وہی جذبہ ہے لیکن ان کی صوفیانہ شاعری کی دنیا چند اشعار سے آگے نہیں جا سکی۔ ان چند اشعار کے علاوہ جو اشعار اس نوعیت کے ہیں ان پر آمد سے زیادہ آورد کا گمان گزرتا ہے اور یہ بات صاف مترشح ہو جاتی ہے کہ شاعر نے یہ شعر جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کسب و کوشش سے رقم کیا ہے۔ اس کے برخلاف جب وہ قصۂ دل کو چھیڑ بیٹھتے ہیں تو مسلسل اور مربوط انداز میں اشعار کہتے چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی ان کی خواہشِ اظہار، تشنۂ تکمیل ہی رہ جاتی ہے اور جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر شعر کا جامہ پہن کر ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے مثال کے بطور ان کی وہ غزل پیش کی جا سکتی ہے جس کا مطلع ہے ؂

جذبۂ بے اختیارِ شوق کام آنے لگا
ان کے دیوانوں میں اب میرا بھی نام آنے لگا

انہیں اپنے جذبہ شوق کی معراج یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کے دیوانوں میں ان کا بھی نام لیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس شعر پر رنگ تصوف نظر آئے لیکن اسی غزل کے بقیہ اشعار اسے رومانی ثابت کر دیں گے۔ آگے چل کر جب اختر صاحب کے ''خوابوں میں وہ ماہ تمام آنے لگتا ہے، اشاروں میں پیام آنے لگتا ہے، نادیدہ صنم بالائے بام آنے لگتا ہے اور صبح و شام ان کا سلام آنے لگتا ہے'' تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ صرف اسی ایک غزل سے اختر صاحب کی صوفیانہ شاعری کا سارا بھرم کھل جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے بدن پر رومانیت کی قبائے رنگین، صوفیت کے بے آب و رنگ لبادہ کے مقابلہ میں زیادہ حسین، دلکش اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔

یہ بات بھی نہیں ہے کہ ان کی یہی ایک غزل رومانی خیالات کی حامل ہے۔ بلکہ یہ رومانی غزلوں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً تمام غزلوں پر رومانیت آسیب کی طرح سایہ فگن ہے۔ ذیل میں ہم ان کے جستہ جستہ اشعار پر گفتگو کرنا

چاہیں گے۔

اختؔر کا عشق والہانہ اور معصومانہ ہے۔ وہ کسی کو چاہتے ہیں اور دل کی انتہائی گہرائی سے ایک صدا نکلتی ہے جو زبانِ حال سے اپنی روداد سنا جاتی ہے۔ وہ عاشق صادق ہونے کی وجہ سے اپنے عاشقانہ خیال کا اظہار بلا خوف رسوائی وشماتت کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود اس کے معترف ہیں کہ وہ ایک عاشق ہیں اور عاشقی ان کا مسلک ہے۔ ابجد عشق سے آگے نہ بڑھنے کا انکسار تو آسمان کے مورد بیداد ہونے سے بچنے کا اک بہانہ ہے ؎

ابجد عشق سے آگے نہ بڑھے ہم اختؔر
آسماں نے ہمیں کیوں موردِ بیداد کیا

☆

بھری محفل میں خود کو اک تماشہ کر دیا میں نے
جو صورت بھی حسیں دیکھی قدم پر بڑھ کے جاں رکھدی

جاں کو قدموں پر نچھاور کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اختؔر عاشق کامل ہیں وہ اپنے محبوب کی تلاش میں محفل محفل، گلی گلی اور صحرا صحرا بھٹکتے پھرے ہیں صحرائے تخیل میں کسی کا نقش پا ڈھونڈتے پھرے ہیں ؎

یہی منزل، یہی حاصل ہے اختؔر کسی کا نقش پا ہے اور میں ہوں

وہ اس نقش پا پر چل کر ایک منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں ایک کارواں مل جاتا ہے اور اس کارواں میں کوئی محمل نشیں بھی ہے۔ اختؔر صاحب کو شاید اسی محمل نشیں کی تلاش تھی۔ لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچے تو دیدار نہ ہو سکا ؎

جنبش سی ہو کے پردۂ محمل میں رہ گئی
بجلی سی تلملا کے مرے دل میں رہ گئی

پھر بھی شاعر اپنے عزم کا پکا ہے، اس کی تڑپ صادق ہے۔ اسے اپنے دلبر کی تلاش ہے اور جب تڑپ صادق ہوتی ہے تو مقصود و مطلوب بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

اختر بھی اپنے بت کو التجا کر کے اپنے پاس بلاتے ہیں اس سے کہتے ہیں کہ اگر تم میرے پاس ہوتے تو ؎

کچھ ہم کہتے کچھ تم سنتے ، کچھ تم کہتے کچھ ہم سنتے
تم اور کہیں ہم اور کہیں ، پھر رام کہانی کیا کہیے؟

اتنا کہنے پر ظالم نے کچھ التفات برتا ہے۔ کچھ رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ جس سے ان کے جذبے کو اور بھی اشتعال ملتی ہے اور ان کا دل جو ایک ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا وہ فوراً چھلک جاتا ہے۔ لیکن معاً انہیں یہ خیال آتا ہے کہ ان کا محبوب نازک دل رکھنے والا ہے۔ اگر وہ اپنی رام کہانی اسے سنائیں گے تو ایسا نہ ہو کہ اسے کوئی صدمہ پہنچے۔ چنانچہ وہ اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے اس معذرت خواہ ہو جاتے ہیں ؎

کہیں تڑپ نہ اٹھے آپ کا دلِ نازک
نہ سنیے سخت المناک ہے مری روداد

اختر صاحب نے جب اپنے محبوب کو اشارتاً یہ بتا دیا کہ ان کی روداد سخت المناک ہے تو وہ دشمن ہوش و خرد اور بھی زیادہ محظوظ ہوا اور اس نے ایک انداز دلربایانہ اختیار کرتے ہوئے بیٹھنے کی زحمت گوارہ کر لی اس کے بیٹھنے کا منظر اختر صاحب کی زبانی ہی سن لیجئے ؎

جھجکے ، کھنچے ، کھڑے ہوئے سن کر بیانِ شوق
پھر مسکرا کے بیٹھ گئے بانکپن سے دور

اس طرح یہ اشعار اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اختر صاحب کے مزاج میں رومانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ جب ایسے اشعار کہتے ہیں تو ڈوب کر کہتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے دل سے نکلی ہوئی صدا ہوتی ہے۔ اس میں آمد ہی آمد نظر آتا ہے اور یہ سب مزاج غزل کے عین مطابق ہے اسی انداز غزل گوئی کے کچھ اور پہلو کا ذکر ہم آگے بھی کرنا چاہیں گے۔

اختر صاحب کی غزلوں میں نگاہ و مژدہ پر فریفتگی کا عالم بھی ہے اور محراب ابرو کا

تصور بھی۔ وہ اپنی اس فریفتگی کو اپنے لئے قابل تعریف سمجھتے ہیں اور یہی تصور ان کا نقد حیات بھی ہے ۔

دل نگاہوں پر فدا قربان مژگان پر جگر
اے جزاک اللہ یہ تیر و سناں میرے لئے

☆

اختؔر اس محراب ابرو کا تصور کیا کہوں
لذت سجدہ ملی، لطف قیام آنے لگا

اختؔر کی نظر میں بے وفائی گناہ ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ وفا بھی کرتے ہیں اور اس کا اظہار بھی۔ لیکن اکثر ان کی وفا کا صلہ ان کو وفا کے روپ میں نہیں ملتا اس لئے کبھی کبھی ان کا دل انہیں ملامت بھی کرتا ہے جس سے اختؔر کو ندامت ہوتی ہے۔ وہ زمانہ کی شکایت کرتے ہیں۔ اس کی بے وفائی کی تاویل کرتے ہیں اور اپنے وسیع مشاہدات کی بنا پر نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وفا اہل جہاں کا شیوہ نہیں ہے۔ اپنی وفا کشی، محبوب اور زمانہ کی بے وفائی اور اپنی وفا پر ندامت کا اظہار کرنے والے اشعار اختؔر کی غزلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ غزل کا یہ ایک خالص روایتی موضوع ہے۔ ہزاروں بار پڑھے گئے اس نوع کے اشعار ندرت بیان کی بناء پر تسکین ذوق کا سامان فراہم کرتے ہیں ۔

وفا، خلوص، محبت کے گوہر نایاب کسی کی نذر کو میں لے چلا یہ سوغاتیں

☆

اختر خدا گواہ ہے بھولا نہیں ہوں میں عہد وفا کبھی جو ہوا تھا کسی کے ساتھ

☆

جنابِ دل نے دعویٔ وفا ایک کھیل سمجھا تھا
دیئے جاتے ہیں حضرت امتحاں پر امتحاں کب تک

یہ تو ان کی وفا کا عالم ہے لیکن اس کا صلہ انہیں ناکامی و نامرادی کے سوا اور کچھ نہ

مل سکا چنانچہ اب وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں ؎

وفا اور اس بت بے گانہ آشنا سے امید
خیالِ خام میں اختؔر نے عمر کی برباد

☆

دیتا ہے کب وفا سے وفا کا کوئی جواب
مشکل سے دو دلوں کو بہم دیکھتا ہوں میں

اختؔر صاحب اپنے تقاضہ کو بھولتے نہیں اور کسی کو بار بار یاد دلاتے ہیں ؎

کہتے نہ تھے نہ کیجئے وعدہ نباہ کا
رسوا ہوئے خود آپ مجھے بھی مٹا دیا

اختؔر صاحب کے یہاں خواہشِ وصل بھی ہے اور غمِ ہجر سے لذت یابی بھی۔ کبھی شبِ ہجراں ان کے لئے وبال جان ہو جاتی ہے اور کبھی انوکھے انداز میں حیات بخش۔ اردو غزل کی روایات سے ویسا ہی انحراف جیسا غالبؔ کے یہاں وصل میں موت کا تصور ہے اور اس شادیٔ مرگ کی توجیہ، شبِ ہجراں کی تمنا کی تکمیل سے کر دی گئی ہے۔ اختؔر بھی ہجر میں جی اٹھنے کی توجیہ کے طور پر ''امید وصل کی کراماتیں'' دیکھتے ہیں ؎

فراق یار میں مر مر کے جی اٹھے کوئی
امید وصل کی اللہ رے کراماتیں

مذکورہ اشعار مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے اشعار کی ان کے یہاں کمی نہیں ہے۔ ان کی رومانیت کا مزید تفصیلی جائزہ لینے کے لئے ان کے مجموعہ کلام کا تفصیلی مطالعہ درکار ہے۔

اب تک کی اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اختؔر کی غزلوں میں تصوف سے زیادہ تغزل کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ تغزل کی ہر ادائے دلکش ان کی غزلوں کو حسن بخشتی ہے۔ ان کی مشاطگی کا فریضہ انجام دیتی ہے اور ان کی شاعری کو ابدیت بہ کنار کرتی ہے۔

جب تک انسان کے دل میں عشق کا جذبہ کارفرما رہے گا۔ جب تک وہ حسن سے متاثر ہوتا رہے گا اور جب تک دنیا میں مردانگی باقی رہے گی اختؔر صاحب کی غزلیں گلے سے لگائی جائیں گی۔ دل میں اتاری جائے گی۔ سازِ دل اس سے ہم آہنگی پیدا کرے گا اور ان کا کلام اپنا وجود باقی رکھے گا۔

اختؔر قادری کی غزلوں کا یہ صرف ایک رخ ہے جو زیر بحث آسکا ہے۔ ان کی غزلوں کے محاسن یہیں ختم نہیں ہوتے۔ اور بھی رخ ہیں جو تابدار اور دلکش ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم ان رخوں کے پردے سرکانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اختؔر صاحب کے یہاں میر تقی میرؔ کی یاسیت بھی ہے اور غالبؔ کی خودداری بھی ۔حکیم مومن خاں مومنؔ کی خیال آفرینی بھی ہے اور اقبالؔ کی بلند آہنگی بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبالؔ کا سارا رنگ و آہنگ من وعن اگر دیکھنا ہو تو ''سرودِ نو'' دیکھا جائے۔ اختؔر کے جیسا شاید ہی کوئی دوسرا رمز آشنائے اقبالؔ اور دنائے راز شاعر پیدا ہوا ہوگا۔ خاص طور پر اختؔر کی نظمیں اقبالؔ کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ اقبالؔ کو خدشہ تھا کہ ؎

دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

شاعری کی یکسانی اور ہم آہنگی تک مجھے کہنے دیجیے کہ اقبالؔ کی آرزو اختؔر نے پوری کردی۔ خود اختؔر کو بھی اس بات پر فخر ہے کہ ان کی آواز اقبالؔ کی آواز سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا کہ اختؔر کا یہ رنگ ان کی نظموں میں نمایاں اور بہ مقدار وافر ہے۔ پھر بھی ان کے بعض غزلیں اور بعض اشعار ان اثرات کی جھلک دکھاتے ہیں ؎

غم و الم میں بھی آئی نہ تا زباں فریاد
بہ فیضِ عشق ملی ہے وہ لذت بیداد

☆

جو مستعد نہ ہو پیکار خیر و شر کے لئے
تو پھر فلاح کی صورت کہاں بشر کے لئے

یہ وہ غزلیں ہیں جن کے مطالعے اوپر درج کئے گئے ہیں، اس کی مثال ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اخترؔ نے مختلف اشعار میں اقبالؔ کے فکر و فلسفہ اور فکر و نظر کی مکمل ترجمانی کی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ ان کی کورانہ تقلید ہے بلکہ یہ زمانہ کے اثرات ہیں، جنہیں ہر حساس دل محسوس کرتا ہے۔ لیکن کم ہی خوش قسمت ایسے ہیں جو ان افکار کو صحیح طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ اخترؔ صاحب ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جو زمانہ کی ہر ادا کا جائزہ لیتے ہیں۔ حالات کا مطالعہ کرتے ہیں اور انہیں اشعار کا جامہ پہنا کر طشت از بام کرتے ہیں۔ اقبالؔ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

جس کو میں نے آشنا لطف تکلم سے کیا
اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

اخترؔ صاحب بھی اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں اور اس حقیقت کو اپنے منفرد پیرائے میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

چلنا سکھایا میں نے جنہیں وائے انقلاب
ٹھکراتے ہیں وہی مجھے اب کجروی کے ساتھ

اقبالؔ کے بعد ذرا میرؔ کی یاسیت اور قنوطیت دیکھئے ؎

ہجومِ یاس سے حالت یہ ہے قلبِ پریشاں کی
جھکولے کھائے ٹوٹی ناؤ جیسے زد پہ طوفاں کی

اس پوری غزل کے مطالعہ سے سخت حیرت ہوتی ہے کہ وہی اخترؔ جو اپنے محبوب سے چہلیں کر رہے تھے۔ زمانہ کی بے وفائی کا گلہ کر رہے تھے۔ تصوف کے میدان میں رزم آرائیاں کر رہے تھے وہ اس قدر غمناک کیوں ہیں۔ دراصل ان کا دل دنیا کی تلخیوں کو برداشت کرتے کرتے ماتم کدہ بن گیا ہے۔ متذکرہ بالا مطلع کی پوری غزل درد میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کبھی کی بھولی بسری یادیں آج انہیں تڑپا رہی ہیں اور محزون وملول کر رہی ہیں۔ کسی کے وجہ یاس دریافت کر لینے سے اخترؔ کو سکون خاطر نہیں ہوتا بلکہ کاہش غم میں اور بھی اضافہ

ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے اپنی ناکامی کی پوری تصویر یکلخت پھر جاتی ہے ۔

نہ پوچھو خاطرِ ناشاد پر جو کچھ گذرتی ہے
کوئی جب پوچھتا ہے وجہ میرے یاس و حرماں کی

شاعر کا دل حساس ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی نگاہ میں صرف اس لئے محترم بن جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر خود کراہ اٹھتا ہے۔

کسی نے آہ کی، آنکھیں مری بھر آئیں، دل تڑپا
مرے حصے میں آئی، سارے عالم کی عزاداری

اخترؔ صاحب کے غم ناک ہونے کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ قوم وملت کی زبوں حالی ہے ان کے دل میں قوم و ملت کا درد بدرجۂ اتم معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرزندان ملت کو ان کی نامرادی و پست ہستی کا احساس دلاتے ہیں، انہیں للکارتے ہیں، دلاسہ دیتے ہیں اور جادۂ عمل پر گامزن رہنے کی ہدایت کرتے ہیں ۔

محال ہے کہ تری آرزو ہو بارآور
نہ تجھ میں سطوتِ شاہی نہ جرأتِ فرہاد

☆

گلزارِ جہاں میں محرومی انجام ہے کوتہ دستی کا
جو ہاتھ بڑھانے سے چوکا پھل پھول کچھ اس کا ہو نہ سکا

اخترؔ صاحب ایک عزم صمیم رکھنے والے شاعر تھے۔ انہیں بادباں اور پتوار کے چاک و شکستہ ہونے کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ ان کے سفر کا محرک ان کا عزم وارادہ ہے۔ ان کی نادیدہ امیدیں ہیں جو انہیں ساحل مراد کی طرف کھینچے لئے جاتی ہیں ۔

ہاں بادباں بھی چاک ہے پتوار بھی نہیں
لیکن مرے سفر کے سہارے کچھ اور ہیں

☆

کنارہ دور ٹوٹی ناؤ گرداب

خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں

اختر دعوت عمل پیش کرتے ہیں۔ موجوں کے تھپیڑے کھانے کو اکساتے ہیں۔ ساحل پر کھڑے تماشہ دیکھنے والوں کو للکارتے ہیں اور انہیں تلاطم خیزئ موج رواں کی طرف بلاتے ہیں۔

لب دریا سے ساحل کا تماشہ دیکھنے والو

تلاطم خیزئ موج رواں کچھ اور کہتی ہے

اختر صاحب کو اس بات کا بھی افسوس رہا ہے کہ اس جہاں میں انہیں کوئی محرم راز دل نہ ملا۔ وہ ہر کس و ناکس کو اپنا راز دل سنانا نہیں چاہتے تھے مگر اپنا راز دل پوشیدہ بھی نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

کس و ناکس سے ہم کیا اپنے دکھ کی داستاں کہتے

کوئی محرم جو ہوتا حالت درد نہاں کہتے

اختر صاحب اپنے درد کا فوری مداوا چاہتے ہیں۔ وہ غم جہاں کو غم ذات بنا چکے ہیں لیکن اب اسی غم ذات میں گھٹ گھٹ کر دم توڑنا چاہتے ہیں۔

اک قہر ہے دل کے لئے یہ سوزش پیہم

یوں جلنے سے اک بار ہی جل جائے تو اچھا

وہ اس دنیا سے مکمل طور پر اکتا چکے ہیں اور اس جہاں کو تہ و بالا کر دینا چاہتے ہیں۔

الٰہی راس نہ آیا یہ خاکداں مجھ کو

مرے لئے کوئی دنیائے تازہ کر ایجاد

اختر صاحب کے یہاں میر کی یاسیت کے پہلو بہ پہلو غالب کی وہ خودداری بھی نظر آتی ہے جو انہوں نے بیدل عظیم آبادی سے حاصل کی تھی۔ در کعبہ کے وا نہ ہونے پر الٹے پھر آنے کا حوصلہ اختر کے اندر بھی نظر آتا ہے۔ انہیں عشق میں گھٹ گھٹ کر مر جانا پسند ہے

لیکن منت کش درماں ہونا قبول نہیں۔ اس لئے کہ اس ان کے جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگتی ہے ۔

عشق میں ٹھیس لگی جذبۂ خودداری کو
کیا سمجھتے تھے کہ منت کش درماں ہوں گے؟

اس خودداری کے ساتھ مومنؔ کی نازک خیالی بھی اخترؔ صاحب کے یہاں جلوہ گر ہے ۔

ان سے کرتا ہوں پیار کی باتیں
ان کا جب سامنا نہیں ہوتا

علامہ اقبالؔ کا ایک کمال فن یہ بھی ہے کہ انہوں نے غزلوں کو نظموں کا تسلسل بخشا۔ اخترؔ قادری کی شاعری اقبالؔ کی صدائے بازگشت اس لئے ہے کہ ان کے یہاں بھی غزلوں میں یہ تجربہ نظر آتا ہے مثال کے بطور درج ذیل مطالعے کی غزلوں کو دیکھا جاسکتا ہے ۔

بلبلیں ہیں جس کی وہ ہم گلستاں آزاد ہے
مژدہ اے اہل وطن ہندوستاں آزاد ہے

☆

انسانیت کی شمع فروزاں کو کیا ہوا
یارب ضمیر حضرتِ انساں کو کیا ہوا

اول الذکر مطلع کی غزلوں میں اخترؔ نے مابعد آزادی کے نتائج وحالات کا ذکر کیا ہے۔ جب ملک طویل جدوجہد کے بعد آزاد ہوا تو اہل وطن نے اور خاص کر مسلمانوں نے پرجوش گیت گائے۔ مسرت وشادمانی کے شادیانے بجائے گئے لیکن وائے محرومی کہ آزادی نے شاعر کے خواب کو شرمنۂ تعبیر نہیں ہونے دیا۔ ملک فرقہ پرستی کا شکار ہوگیا۔ انسان انسان کا دشمن بن گیا۔ اس طرح مذکورہ غزل نغمۂ آزادی اور توصیف وطن کی بجائے ماتم انساں اور نوحۂ آزادی بن گئی۔

غزل ثانی ایک مسلسل اور مربوط غزل ہے۔ اس غزل میں شاعر استفہامیہ انداز میں عام انسانوں کے اور مسلمانوں کے حال زار پر گریہ کناں ہے۔ وہ اہل وطن سے یہ سوال

پوچھتا ہے کہ آج انسانیت اور اس کی اعلیٰ قدریں پست کیوں ہوگئی ہیں؟ ان غزلوں میں انتشارِ فکر کے بجائے انضباط پایا جاتا ہے۔ اس کا ایک مرکزی خیال ہے جس کے گرد غزل کا ہر شعر گردش کرتا ہے۔ اس کے باوجود یہ غزل قطعہ نہیں بنتی۔ اس پوری غزل میں شاعرانہ رنگ و آہنگ بھی ہے اور مفکرانہ کیف و کم بھی۔

اخترؔ صاحب کے یہاں ہر جگہ پاس روایت نظر آتا ہے لیکن جب ساقی کا ذکر وہ کرتے ہیں تو وہاں روایت سے بغاوت کی جھلک ملتی ہے۔ اخترؔ صاحب اپنے ساقی سے خوش اور مطمئن ہیں۔ جب ہر طرف انہیں مایوسی اور تلخ کلامی سے واسطہ پڑتا ہے تو صرف نگاہ ساقی ہے جو ان کے لئے مسیحائی کا کام کرتی ہے۔ اس طرح ساقی کے ذکر میں ان کے یہاں اظہار تشکر ہے۔ یہ اردو کی عام روایت سے الگ ایک انداز ہے ؎

اخترؔ ترے دماغ کا کیا پوچھنا کہ آج
ساقی کا جس پہ فیض ہو وہ جم سے کم نہیں

☆

نگاہ لطف ساقی سے رہے سرشار ہم ورنہ
ہمارے سامنے اس بزم میں ساغر کہاں ٹھہرا

☆

مرحبا صد مرحبا اٹھی وہ ساقی کی نگاہ
مژدہ باد اے تشنگی گردش میں جام آنے لگا

اس تحریر سے اخترؔ قادری کی غزل گوئی پر جو روشنی پڑی ہے مجھ کو خود اس سے سیرابی حاصل نہیں ہوسکی۔ یہ احساس تشنگی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ اخترؔ صاحب کے ہمہ گیر نقطۂ نظر پر بحث کی جائے۔ ان کے متنوع خیالات کو پرکھا جائے۔ ان کے مشاہدات سے اردو والوں کو واقف کرایا جائے۔ یہ محض افہام و تفہیم کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے پھر بھی کلام آخر کی طرح یہ چند کلمات نظر قارئین کرنا چاہوں گا۔

اخترؔ صاحب ایک اچھے غزل گو شاعر ہیں لیکن انہیں قدر دانی کا منصب نہیں ملا جس کا خود ان کو احساس ہے ؂

کمالِ فن کی دنیا میں نہیں کچھ قدر اے اخترؔ
یہ جنسِ بے بہا ہے اک متاعِ رائیگاں اب تک

زمانہ ان کی قدر کرے نہ کرے ان کی حیثیت بہر حال مسلم ہے۔ وہ بذات خود ایک انجمن ہیں۔ ایک تحریک ہیں۔ ایک دبستاں ہیں ڈاکٹر عبدالوہابؔ اشرفی سے لے کر ظفرؔ حبیب تک ان کا ثنا خواں و قدر داں ہے ؂

اخترؔ سخنوروں میں یہ چرچے ہیں آج کل
اندازِ فکر و فن کے تمہارے کچھ اور ہیں

ان کا اندازِ فکر و فن واقعی سبھوں سے جداگانہ ہے۔ زمانے کا کیا بھروسہ وہ کب کس کو سر پر چڑھالے گا اور کب کسی سے بے اعتنائی برتے گا کہا نہیں جا سکتا۔ عصبیت، معاصرانہ چشمک، علاقائی تنگ نظری، باشندگانِ بہار کی پست ذوقی و کم ہمتی، صوبائی تعصب، ہم عصر ناقدروں کا معاندانہ جذبہ یہ سب اخترؔ کی شاعری کو روگ بن کر لگ گیا۔ حالانکہ ان کی وجہ سے ان کی شاعرانہ حیثیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ چونکہ ہمارے ناقدین مردوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں اس لئے اخترؔ صاحب کی حیات میں ان کی عظمت کا اعتراف میں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی بلندئ فکر سے انکار ممکن نہیں۔ اردو کے اعلیٰ پایہ کے غزل گویوں میں ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا۔

مطبوعہ ماہنامہ مریخ، پٹنہ۔ جولائی ۱۹۶۸ء

☆☆

اختر قادری کی نظم نگاری

جولائی ۱۹۶۸ء میں ''اختر قادری کی غزل گوئی'' کے زیر عنوان میرا ایک مقالہ ماہنامہ ''مریخ'' پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ کی تیاری کے وقت میں نے اختر قادری کے مجموعہ کلام ''سرودنو'' کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ غزل اور نظم دونوں اصناف پر بیک وقت لکھنا ممکن نہیں۔ اسی لئے میں نے یہ لکھا تھا:

> ''یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اختر قاری ایک شاعر ہیں اور حقیقی شاعر ہیں۔ وہ غزل گو سے زیادہ نظم نگار ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ''سرودنو'' اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کی نظم نگاری پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اختر صاحب کی عظمت پر مہر توفیق ثبت کرنے والی، ان کی شاعری کو دوام بخشنے والی اور ان کو زندۂ جاوید کرنے والی ان کی نظمیں ہیں۔''

اختر قادری کی شاعرانہ رفعت کے اس احساس اور ان کی نظم نگاری کی عظمت کے اعتراف کے باوجود زندگی نے فوری طور پر مہلت عطانہ کی کہ دوبارہ اس موضوع پر قلم اٹھا سکتا۔ یہاں تک کہ اس کے ٹھیک ایک سال بعد ظہیر ناشاؔد در بھنگوی کا ایک مضمون ''اختر قادری ایک مطالعہ'' مطبوعہ ماہنامہ ''صبح نو'' جولائی اگست ۱۹۶۹ء نظر سے گذرا۔ لیکن وہ مضمون بھی اس کے سوا اور کچھ عطانہ کرسکا کہ ''مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ میں اختر قادری صاحب کی شاعرانہ خصوصیتوں کا بھرپور جائزہ لے نہیں سکا۔ زیر نظر مضمون میں صرف ان کی غزلوں سے متعلق اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کرسکا ہوں۔ انشاءاللہ موقع ملا تو کبھی ان کی نظموں سے متعلق اظہار خیال کروں گا۔ شوق کو مہمیز لگی لیکن

اگرچہ ہوئی تھی زیادہ ہوس   ولیکن ''خدا'' نے کہا مجھ کو بس

زندگی اپنے چکر چلتی رہی۔ سلسلۂ تعلیم ختم ہوا۔ معلمی شروع کی تو پھر ''سرودنو'' سے واسطہ پڑا۔ ڈگری کورس کے طلبا کو جب پڑھانے بیٹھتا تو خود بھی جھومنے لگتا۔ پوری جماعت متبسم ہو جاتی ہے

بے رحمی فلک پر، اظہار غم سے حاصل
کیوں یہ گلہ ستم کا، کیا چشم نم سے حاصل
اب ہجر دائمی پر، رنج و الم سے حاصل

رو رو کے جان اپنی اے جاں نہ یوں گھلاؤ
میں تم کو بھول جاؤں تم مجھ کو بھول جاؤ

اب دل سے اپنے پہلی باتوں کو تم بھلا دو
حسرت، امید، ارماں ہر ایک کو مٹا دو
تصویر، خط، نشانی جو کچھ بھی ہو جلا دو

بے کار اپنی جی کو اک روگ کیوں لگاؤ
میں تم کو بھول جاؤں تم مجھ کو بھول جاؤ

دنیا کا اک روش پر دو دن نہیں ٹھکانا
پہلو نیا بدلتا ہے، ہر گھڑی زمانہ
پہلے یہ التجا تھی، مجھ کو نہ بھول جانا

اور اب ہے یہ تمنا خاطر میں بھی نہ لاؤ
میں تم کو بھول جاؤں تم مجھ کو بھول جاؤ

اختر قادری صاحب کی نظمیں اب مجھ سے دن بہ دن شدید تقاضہ کرنے لگیں۔ میں نے اس دوران میں یہ بھی چاہا کہ کوئی پیش رو بن کر آگے نکل جائے اور اس کے لئے میں نے اختر صاحب کی ایک غزل پر تبصرہ کر کے ماہانہ ''المجیب'' پھلواری شریف میں شائع

کرادیا۔لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ بہار کے سپوتوں کو نیند آ گئی۔ یا پھر شب گذاری کی خاطر انہیں دوسرے موضوعات ملتے رہے۔ اختر قادری کی نظموں پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ یہاں میں ڈاکٹر احمد حسین کے ذکر سے قصداً گریز کر رہا ہوں کہ ان کا مضمون ''اختر قادری کی نظم نگاری'' مطبوعہ ماہنامہ سب رنگ'' الہ آباد کوئی بھرپور مضمون نہیں ہے۔اس کی حیثیت بس ایک ٹیبل ٹاک کی تھی۔

اختر قادری کا صرف ایک مجموعہ کلام ''سرود نو'' کے نام سے شائع ہو سکا جو نظموں، غزلوں، رباعیوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ رباعیات اور قطعات کی تعداد زیادہ ہے اور اس کا انداز بھی نظموں ہی کے جیسا ہے۔ البتہ غزلیں اور نظمیں دو متفرق آہنگ کی حامل ہیں۔ آج ہم آپ کو اختر قادری کے چمن زار نظم کی سیر کرائیں گے جس کا ہر گل بوٹہ آپ کو منفرد، متفرق اور ممیز نظر آئے گا۔ لالہ، گل اور نسرین کے جدا جدا رنگوں میں بہار کا اثبات چاہنے والوں کو میرے ساتھ آ جانا چاہئے۔

''سرودنو'' کی پہلی نظم ''ترے فراق میں'' ہے جس کے ذیل میں سنہ تخلیق ۱۹۲۹ء درج ہے اور جس کے متعلق خود اختر صاحب کہتے ہیں کہ یہ اس زمانہ کی تخلیق ہے جب وہ نویں درجہ کے طالب علم تھے۔ (مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ تقریر آل انڈیا ریڈیو پٹنہ) شاعر اس کائنات کی تڑپتی اور پھڑکتی ہوئی ہر شئے پر نگاہ کرتا ہے اس کی بے چینی کا سبب تلاش کرتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے ۔ ع

ترے فراق میں شاید یہ حال ہے اے دوست!

شاعر کا یہ دوست، مجازی اور ظلی نہیں۔ حقیقی اور اصلی ہے جسے دنیا مختلف ناموں سے یاد کرتی ہے اور یہ وسیع وعریض کائنات جس کی صفات کا مظہر ہیں ؎

یہ حسن بُعد مکانی ترے فراق میں ہے
یہ سوز غم کی کہانی تیرے فراق میں ہے
فریب عالم فانی ترے فراق میں ہے

ترا ہی ذکر تری چاہ آرزو تیری
ہر ایک دل میں سمائی ہے جستجو تیری

یہ نظم اس بات کی پیش گوئی کرتی ہے کہ اختؔر کا مزاج تعمیر پسندانہ ہے۔ ان کی شاعری کا مقصد تربیت ذہن، تہذیب مزاج اور تعمیر فکر ہے۔ گرچہ حیات کے دوسرے تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے ایسی نظمیں لکھی ہیں جو خالصتاً رومانی اور عاشقانہ ہیں لیکن ایسی نظمیں کم ہیں اس لئے انہیں، ان کی فکر کی اساس نہیں کہا جاسکتا ہے۔ پھر بھی یہ نظمیں چونکہ قابل لحاظ ہیں اس لئے ہم ان کا ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ایسی نظموں کی تخلیق کے وقت شاعر پر رومان غالب رہا ہے اور اسی لئے ان میں سرمستی و مدہوشی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ایک نظم ''شاہکار قدرت'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

موج صبا گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے
صحن چمن میں ہر سو خوشبو لٹا رہی ہے
سبزہ لہک رہا ہے شاخیں لچک رہی ہیں
مستانہ وش صبا سے کلیاں چٹک رہی ہیں

☆

ہر شئے میں دلکشی ہے، ہر شئے میں دلبری ہے
مثل عروس تازہ فطرت سجی ہوئی ہے

یہ سب کچھ ہے۔ فطرت کا حسن اپنے شباب کی رنگینیاں دکھا رہا ہے۔ چاندنی پر کیف ہے۔ فضا سہانی ہے۔ دنیا خواب کے نشے میں مخمور کروٹیں لے رہی ہے۔ تارے تھکے تھکے سے خوش خرامی کر رہے ہیں۔ مستی بھری ہوائیں خوشبو لٹا رہی ہیں لیکن شاعر کو ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے اور وہ کمی اس کے اپنے محبوب کی ہے ؂

اے دوست تو بھی اس دم گر جلوہ بار ہوتا
قدرت کا یہ مرقع اک شاہکار ہوتا

پیش کش کا یہ انداز۔ محبوب کی تعریف کے لئے نئے نئے پہلو کی تلاش اور اس کی عدم موجودگی میں ہر شئے کی دلفریبی سے انکار بے شک ایک اچھوتا انداز رکھتا ہے۔ اس طرح عاشقی نباہنے کی ایسی روش انہیں بزرگوں کے حصے میں آئی ہے۔ یہ نظم بلاشبہ بہت ساری رومانی نظموں پر بھاری ہے۔ ان کے علاوہ اختر صاحب نے اور بھی رومانی نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً ''بھول جاؤ، نقش فراق، چاند، چاند سے، دعائے محبت اور بیان شوق''۔ یہ تمام نظمیں جدا جدا، عاشقانہ تجربات و سانحات کی شعری تفسیریں ہیں بھول جاؤ میں شاعر اپنے محبوب سے گذارش کرتا ہے کہ وہ اب اسے بھول جانے کی کوشش کرے تو ''نقش فراق'' میں خوبصورت، چمکتی چاندنی کی تمام تر رعنائیوں سے انکار کرتے ہوئے محبت کا بدلہ فرقت کو بتاتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ فراق کے مارے کو سکون دل نصیب نہیں ؎

کہا نگاہ نے فطرت نکھار پر ہے آج
عجیب دلکش و راحت فضا ہیں نظارے
فضا میں گونجی اک آواز ناگہاں اختر
سکون دل کہیں پاتے ہیں ہجر کے مارے

شاعر ''چاند سے'' پیہم سولات پوچھتا ہے ؎

کیا فلک پر بھی غم الفت سے دل پامال ہے؟
کیا وہاں کے بھی حسینوں میں ہے پندار غرور؟
کیا تری دنیا میں بھی جنس وفا معدوم ہے؟
کچھ تو کہہ اے چاند آخر کس لئے مغموم ہے؟

مغموم چاند اسے کیا جواب دے؟ وہ تو مغموم نہیں، مغموم تو خود شاعر ہے کہ جسے محبت کے صلہ میں ناکامی ملی ہے۔ شاعر کے دل افسردہ نے جو محسوس کیا ہے اسے ساری انجمن کو دکھایا ہے۔ اختر کی رومانی نظمیں بس اسی قدر ہیں۔ ''شاہکار قدرت'' اور ''بھول جاؤ'' ان کی کامیاب رومانی نظم ہے۔ ان دو نظموں میں شاعر نے اپنے سارے رومانی جذبات کو سمیٹ

کر رکھ دیا ہے۔

رومانی نظموں کے بعد اختؔر کی نظمیہ شاعری کا اصل رخ سامنے آتا ہے جس کے متعلق قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ اختؔر دراصل تعمیر پسند شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری شاعری کہیں پیمبرانہ انداز اختیار کرتی ہے، کہیں داعیانہ۔ کہیں ناصحانہ بن جاتی ہے تو کہیں فلسفیانہ اور مفکرانہ۔ کبھی وہ حب الوطنی کے جذبوں سے سرشار اور مغلوب نظر آتے ہیں تو کبھی جاگیر دارانہ نظام سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے عصر حاضر کی تمام تر خرابیوں پر طنز و تبصرہ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن فکر کی اس رنگا رنگی میں جو واضح اور غالب رجحان اور انداز ہے وہ اسلام پسندانہ ہے۔ اسی اسلام پسندی نے ان کے اندر تعمیر پسندی کو جنم دیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ؂

بیان زلف و رخ، اشعار میں ڈھونڈھیں، جو اے اختؔر
انہیں تو ''شاعری جز ویست از پیغمبری'' کہہ دے

شاعری کو جزو پیغمبری زبانی طور پر کہہ دینا اور واقعتاً اس دعویٰ پر خود کو کھرا ثابت کرنا یہ دونوں جدا جدا باتیں ہیں۔ اختؔر کہاں تک اس دعوئ پر پورے اترے ہیں اس کے لئے میں ان کی کچھ نظموں کا حاصل مطالعہ آپ کے حضور آئندہ سطور میں پیش کرنا چاہوں گا۔

سب سے پہلے ان کی معرکۃ الآراء نظم ''مجاہد'' دیکھئے جس میں شاعر نے ایجاز نگاری کا کمال دکھاتے ہوئے پہلے حالات کی تصویر کشی کی ہے، پھر ان حالات کو بدلنے کے لئے جس دم خم کے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ دور حاضر محتاج ہے، اس بات کا کوئی مجموعۂ صفات و کمالات اٹھے اور وقت کے اس سرکش دھارے کو موڑ دے ؂

آج پھر عالم پہ چھائی ہے گھٹا بیداد کی
اے مجاہد اٹھ ضرورت ہے تری امداد کی

اس کے بعد ان کی دوسری شاہکار نظم ''یہ مانجھی'' کا مطالعہ کیجئے۔ وہاں بھی شاعر

نے فنی چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ حالات کی دیگر گونی کا بڑے ہی شدومد سے تذکرہ کیا ہے اور عصر حاضر کے نوجوانوں کو نشانۂ ملامت بنایا ہے اس نظم کے ہر ہر لفظ کی نشتریت قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی ۔

یہ دھان پان گل اندام نازنیں بانکے
کمر لچکتی ہے موج نسیم سے جن کی
کلیجہ جن کا دھڑکتا ہے شور طوفاں سے
مرے نصیب یہ مشکل کا وقت یہ مانجھی
ہم ہی ضعیفوں کو پتوار تھامنا ہے آج
کہ زن قماش جوانوں کا سامنا ہے آج

نئی نسل کے تعمیری کردار کی بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ بلکہ اخترؔ کی بہت ساری نظمیں تعمیر کردار کی دعوت اپنے دامن میں لئے بیٹھی ہیں ۔

ہیں روز ازل سے یہی فطرت کے اشارے
جیتے نہیں جیتے ہیں جو اوروں کے سہارے
بڑھ بڑھ کے پہاڑوں کے قدم چوم رہے ہیں
تنکوں کو بہاتے ہوئے سیلاب کے دھارے
طوفاں کا نہ مانجھی کا نہ قسمت کا گلہ کر
لا کھینچ کے ساحل کو سفینے کے کنارے
جو پائے گہر بازوؤں پر اپنے نظر کر
طوفاں تو سمندر میں نئی شئے نہیں پیارے

یہ اشعار ان کی نظم ''اشارے'' کے ہیں۔ اس طرح ان کی نظم ''ایک انگارہ'' میں بھی دعوت عزم وعمل کا انداز ہے دیکھئے ۔

وہ نوجوان ہے ملت کی آنکھ کا تارہ
جو مستعد ہو بدلنے کو وقت کا دھارہ

جسے ہلا نہ سکیں آندھیاں حوادث کی
جو رکھتا ہو نہ نفسِ گرم و سیرت خارہ
جگر کے سوز سے جب تک نہ بہرہ ور ہو یقیں
تمام دفتر دانش گماں کا پشتارہ
مگر بہ ایں ہمہ میں پرامید ہوں اخترؔ
ہزار تودۂ خاشاک ایک انگارہ

تودۂ خاشاک کو خاکستر بنانے والا ایک انگارہ اسی وقت انگارہ کی صفت کا حامل ہوگا جب اس کا یقین جگر کے سوز سے بہرہ ور ہوگا۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ ۔ع

اسوۂ شبیر پر ہو کار بند اے مرد کار

جب مرد کار اسوۂ شبیر پر کار بند ہو جائے گا تو خود اس کے اندر وہ کیفیتیں پیدا ہو جائیں گی جو اسے کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیں گی اور شاعر کا یہ تقاضہ ۔

گر شباب زندہ داری زود شو، ناگاہ شو شیوۂ مردانہ گیر و درصف جنگاہ شو

اسے میدان عمل میں کود جانے پر مجبور کر دے گا۔ شاعری کے اس تقاضہ سے مجبوری کے بعد جو ماحول بنے گا وہ "رواں ہے میر کارواں" کے جیسا ہوگا۔

اخترؔ صاحب کی یہ نظم دراصل استقبال کی کوکھ سے جنم لینے والی اس جماعت کا رجز ہے، جو اپنی نگاہوں میں یقین کی تجلیاں لئے ہوئے اور تبسم کی جاں فزا تسلیاں لئے ہوئے۔ قدم قدم پر عزم استوار ظاہر کرتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جائے گی ۔

ضمیر کائنات جس کا کر رہا تھا انتظار
مچل رہی تھی جس کے پاؤں چومنے کو رہ گذار
وہ دیکھ چشم شوق دیکھ پر شکوہ و باوقار
رواں ہے میر کارواں

یہ میر کارواں کیوں رواں دواں ہے خود شاعر کی زبانی اس کی توجیہہ سن لیجئے ۔

بڑھے چلو کہ دور ہے، ابھی مقام آدمی

بڑھ چلو کہ آدمی، ہے یاں غلام آدمی

بڑھے چلو بڑھے چلو، ابھی رکو نہ زینہار

ابھی رکو نہ زینہار

ابھی رکو نہ زینہار

رواں ہے میر کارواں

شاعر کے پیش نظر لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (ترجمہ:۔وہ بات تم کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے ہو) کی بات بھی ہے۔اس لئے یہ محض دعوت ہی نہیں دیتا بلکہ خود بھی چل کر دکھاتا ہے۔خواہ تنہائی کا عالم ہو، پھیلی ہوئی گھٹائیں ہوں، گھاٹیاں بھیانک ہوں اور راستے مسدود نظر آتے ہوں پھر بھی ؎

رک نہیں سکتا چلوں گا یوں ہی چلتا جاؤں گا

مانتا ہوں مشکلیں حائل ہیں منزل دور ہے

زور طوفاں بلا ہے اور ساحل دور ہے

پھر بھی بڑھتا جاؤں گا ہاں یوں ہی بڑھتا جاؤں گا

آگے بڑھنے اور مستقل بڑھنے کا یہ سلسلہ اس لئے جاری ہے کہ شاعر کو یہ یقین کامل ہے کہ ایک نہ ایک دن ؎

ظلمتیں ہوں گی گریزاں جلوۂ خورشید سے

شام غم اپنی بدل جائے گی صبح عید سے

اختؔر قادری نے اپنا دامن ادب چمن زار اقبال کے گل بوٹوں سے سجایا ہے۔ان کا یہ وصف ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔جس طرح علامہ اقباؔل کی شاعری میں رجائیت کی جلوہ گری ان کی شاعری کو تابناک بناتی ہے۔اسی طرح اختؔر قادری کے یہاں بھی لطف چاندنی ہر چہار طرف بکھری نظر آتی ہے۔۱۹۴۶ء کی تحریر کردہ ان کی نظم

''ماحول'' کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

تھامے ہوئے ہاتھوں سے جگر دیکھ رہے ہیں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہے ہیں
اخترؔ کرن امید کی اس ظلمت شب میں
اللہ نے بخشی ہے نظر دیکھ رہے ہیں

ٹھیک اسی طرح ''پکار'' میں فریاد، چیخ، نالۂ زار، پندار شکستہ، مجروح وقار، زنداں کی لرزتی ہوئی غم ناک پکار، کے ماحول میں شاعر خدا سے دعا کرتا ہے۔ اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔ اس کی دعاؤں کے پیک کمک لے کر آئے ہیں۔ اس کمک میں جو چیزیں آئی ہیں اسے دیکھئے ؎

مژدہ باد آتے ہیں اطلس کی قباؤں والے
نوع انساں کو غلامی سے چھڑانا ہے جنہیں
جن کی ہیبت سے لرزتے ہیں جفاؤں والے
حرم اس ظلم کی بستی کو بنانا ہے جنہیں
آئے آئے تری حرمت کے نگہدار آئے
ناصر اہل وفا، دافعِ اشرار آئے

ان نظموں کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک مثالی کردار کے حامل وہ لوگ ہیں جن کے خمیر میں دین محمدیؐ داخل ہے۔ ان کے وہ مثالی کردار محض ان کے پسندیدہ دین کے محافظ اور داعی بن کر سامنے نہیں آئے ہیں بلکہ نوع انساں کو غلامی سے چھڑانا ان کا مقصد اولین ہے۔ اس طرح ان کی اسلام پسندی کے آنچل میں انسان دوستی کی دولہن اپنا مکھڑا چھپائے اٹکھیلیاں کرتی نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی نظم ''بادۂ مغانہ'' خصوصیت سے قابل مطالعہ ہے ؎

وہی زعم باطلانہ وہی طرز جاہلانہ
اسی راہ پرخطر پر ہوا گامزن زمانہ

وہی فتنہ قیصری کا وہی شیوہ خواجگی کا
وہی دام رنگ و خوں کا، وہی طور آذرانہ
یہ خرد کی کم نگاہی یہ فریب خوردہ راہی
کہیں کاروان آدم نہ ہو موت کا نشانہ

اس لئے شاعر خدا سے دعا کرتا ہے۔

دل مرتضیٰؓ عطا کر دل ابن مرتضیٰؓ دے
وہی دل جسے صعوبت ہو عمل کا تازیانہ

انسان دوستی کے اس جذبہ نے شاعر کو وطن دوستی بھی سکھایا ہے۔ لیکن وطن پرستی کے گناہ سے اس نے اپنے دامن کو آلودہ نہیں ہونے دیا ہے۔ یہ بات لائق ستائش ہے۔ ان کی نظمیں ''یاد وطن'' اور ''نئی بہار'' ان کے جذبۂ حب الوطنی کی عکاس ہیں۔

اختؔر قادری کی شاعری کا Active دور ہندوستان کی آزادی کے آس پاس کا ہے۔ جب پورے ملک پر سامراج کا قبضہ تھا۔ جنگ اور پیکار کا ماحول تھا۔ معصوم ہندوستانی طرح طرح کی سازشوں کا شکار ہو رہے تھے۔ ملک میں روس کے صنعتی انقلاب کے اثرات نظر آنے لگے تھے۔ ترقی پسندوں کی ٹولی لال جھنڈا لئے سب کو جھک جھک کر سلام کرنے میں مصروف تھی۔ علامہ اقبالؔ کے تصور کی اسلامی دنیا عالم تخلیق میں تھی۔ فتنہ وفساد کا بازار گرم تھا۔ کشاکش اور غیر یقینی کا ماحول تھا۔ افرنگی سامراج کے زوال کے پہلو بہ پہلو ہندو سامراج کی پیش قدمی کے آثار بھی نظر آ رہے تھے اختؔر کی نظمیہ شاعری اس فضا کا آئینہ بن کر ابھری۔

اختؔر صاحب نے مفکرانہ اور فلسفیانہ رنگ بھی اختیار کیا۔ ''اسرار حیات، اور یہ دنیا'' ان کی فلسفیانہ اور مفکرانہ شاعری کی مثالیں ہیں۔ اسرار حیات کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

ہے تغیر ہی میں پنہاں راز حفظ زندگی
زندہ رکھتا ہے ہر اک قطرے کو اس کا اضطراب

مستتر ہے جنبش پیہم میں راز زندگی
ٹوٹ ہی جاتا ہے ساکن ہو کے ساز زندگی
غم جسے سمجھا ہے ساز برگ و بیداری ہے وہ
غم کے پردے میں نظر آتے ہیں اسرار حیات
کثرت لمحات ہستی نیست وجہ افتخار
غنچۂ پژمردہ را جنبش بہ ماند یادگار

جس عہد میں اختؔر قادری کی شاعری پروان چڑھی تھی اس وقت پابند شاعری کا رواج تھا۔ ہیئت میں تجربہ کرنے کی ہمت کا عام طور پر فقدان تھا۔ مروجہ انداز میں باتیں کرنے کی کوشش پسندیدہ تھی۔ اس لئے اختؔر بھی انقلابی طرز اختیار نہ کرسکے۔ جس کی وجہ سے ہیت کا تجربہ ان کے یہاں نظر نہیں آتا ہے۔ پھر بھی اختؔر نے سانیٹ کے طرز میں کئی نظمیں قلم بند کی ہیں۔ اس طرز کو اختیار کرنے سے ان کی شاعری ایجاز و اختصار کے حسن سے آراستہ ہوگئی ہے۔ الفاظ کا محتاط استعمال ان کی فنکارانہ عظمت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ بلاشبہ ان کی شاعری آنے والی نسل کے لئے ایک بیش بہا تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مطبوعہ ماہنامہ مریخ پٹنہ، مارچ ۱۹۹۴ء

اختر قادری
(کے تعمیر پسندانہ رجحانات)

۱۹۶۶ء کی بات ہے، جب گنیش دت کالج بیگوسرائے کے اردو آنرز کے طالب علم کی حیثیت سے بھاگلپور یونیورسٹی سے میں نے اول درجہ کی سند حاصل کی۔ لطف کی بات یہ تھی کہ مذکورہ کالج سے میں تنہا طالب علم تھا جو اول درجہ سے اردو آنرز میں کامیاب ہوا تھا۔ لکھمنیاں کے لوگ اس بات سے خوش تھے کہ ان کے عزیز نے اچھی کامیابی حاصل کی ہے اور کالج کے اساتذہ مشکور تھے کہ اس سال میں نے کالج کی لاج رکھ لی تھی۔

اب مرحلہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کا تھا۔ کمزور معیشت اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ میں دور دراز جا کر ایم۔ اے اردو میں داخلہ پاؤں۔ کسی طرح یہ طئے ہوا کہ اسے پٹنہ یونیورسٹی بھیج دیا جائے۔ میں خوش تھا کہ میری دو تمنائیں پوری ہوں گی اول ایم۔ اے کرنے کی اور دوئم پٹنہ یونیورسٹی جا کر ڈاکٹر اخترؔ اورینوی اور علامہ جمیلؔ مظہری جیسے محقق، تنقید نگار افسانہ نگار اور شاعر سے سبق لینے کا موقع ملے گا۔

نہ جانے کس طرح میرے والد صاحب کو یہ خبر ملی کہ اخترؔ صاحب اپنے طلبا سے زیادہ طالبات کو لائق اکرام و نوازش سمجھتے ہیں اور جمیلؔ مظہری، آزاد فطرت فلسفی شاعر ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا بیٹا پٹنہ میں رہ کر ایسا نہ ہو کہ ذوق رخ یار پیدا کر لے یا پھر حیات و کائنات کے فلسفوں کو سمجھنے میں سر کھپانے لگے۔

یہ کشمکش چل رہی تھی، میں ہر حال میں کم از کم پٹنہ یونیورسٹی جانا چاہتا تھا۔ یا پھر اپنے ماموں جان ابو محمد شبلی صاحب کے پاس لکھنؤ یونیورسٹی یا پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جانے کا آرزومند تھا اور والد محترم اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا تھے۔

اسی دوران میرے عم محترم (والد صاحب کے ماموں زاد بھائی) حکیم فضل الرحمٰن صاحب مظفر پور سے اپنے گھر تشریف فرما ہوئے۔ یہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ ان کے درمیان یہ بات طئے ہوئی کہ میں پہلے بہار یونیورسٹی مظفر پور جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لوں۔ چنانچہ میں عمِ محترم کے ہمراہ استاد الاساتذہ ڈاکٹر اخترؔ قادری صاحب کے دربار میں باریاب ہوا۔

سید شاہ اخترؔ قادری (نور اللہ مرقدہٗ) نے سب کچھ سننے کے بعد فرمایا کہ اس شریف زادہ کو پٹنہ یونیورسٹی کیوں بھیجا جائے یہ میرے پاس رہ کر پڑھے گا۔ میں اسے فل فری اسٹوڈنٹ شپ بھی دوں گا اور سرکار سے میرٹ اسکالر شپ بھی دلاؤں گا۔ اس پیش کش پر اور اندازِ ہمدردی پر میں رام ہوگیا۔ اسی وقت فارم آیا بھرا گیا۔ عم محترم نے جیب سے مطلوبہ روپے نکالے اور میں جب گھر واپس آیا تو بہار یونیورسٹی کا طالب علم بن کر آیا۔

استادِ محترم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی جس کے نقوش عمر بھر کے لئے پردۂ دل پر مرتسم ہیں۔ اب کیا تھا میں فرصت نکال کر ان کی نشستوں میں شریک ہونے لگا اور وہ مجھ کو قریب تر کرتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ لیکن ایک سال بعد جب اسپیشل پیپر کے انتخاب کا معاملہ آیا تو حاتمؔ ماہر رامپوری (مرحوم) جو ہمیشہ سے قادری صاحب کے رحم و کرم کے مستحق تھے ان کے ساتھ اقبالیات کا مطالعہ کرنے لگے۔ نازؔ قادری اور شمشاد سحرؔ (مرحوم) سلیمان صاحب کے ساتھ علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھانے میں لگ گئے اور میں فاروق صدیقی کے ہمراہ استاذی شمیمؔ صاحب کے ساتھ ہو کر بہار اسکول کے استحکام، بقا اور فروغ کی جدو جہد میں لگ گیا۔

انہیں ایام میں وہابؔ اشرفی صاحب ایل آئی سی سے مستعفی ہو کر ریسرچ اسکالر بعدہٗ ریسرچ فیلو بن کر کامیابی کی منزل کی جانب قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس مرحلہ میں ان کے سر پر قادری صاحب کا دستِ شفقت مضبوط طور پر موجود تھا۔ میں نے

انہیں دنوں دنیا کے مشہور افسانوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر ایک طبع زاد افسانہ بھی لکھا جسے وہاب صاحب کے سامنے بغرض اصلاح پیش کیا۔ وہاب صاحب نے اس افسانہ کو پسند کرتے ہوئے آزادانہ اس سلسلہ کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور آہستگی سے یہ اشارہ بھی کہ میں جگہ خالی کرنے والا ہوں تم آگے آ کر یہ خلاپُر کر لو۔

انہیں دنوں پٹنہ کی سطح پر قادری شکنی کی ایک سازش کی داغ بیل پڑ چکی تھی جس سازش کو کمزور کرنے کے لئے وہاب اشرفی صاحب نے قادری صاحب کی شاعرانہ عظمت پر ایک مقالہ لکھ کر شائع کرایا تھا وہ مقالہ پٹنہ میں زیرِ بحث تھا اور اس کے سہارے قادری صاحب کی شاعری پر تبصرہ کیا جا رہا ہے جس کا انداز معاندانہ کم زیادہ تھا، منصفانہ کم۔ حسن اتفاق کہ رحمانیہ ہوٹل میں شام کی ایک نشست میں میں بھی شریک تھا۔ کئی لوگوں کے ساتھ ظفر اوگانوی صاحب مرحوم بھی اس میں موجود تھے۔ بحث سرقہ اور توارد پر چل رہی تھی اور حوالہ ''سرودِ نو'' سے دیا جا رہا تھا۔

میں اس سلسلہ کو رکنے دینا نہیں چاہ رہا تھا اس لئے دلچسپی سے شریکِ محفل رہا۔ محفل کے سبھی شرکاء پٹنہ یونیورسٹی کے پروڈکٹ تھے اور میں بہار یونیورسٹی کا سال پنجم کا طالب علم تھا۔ پٹنہ سے مظفر پور واپس آنے کے بعد میں نے وہاب اشرفی صاحب سے ملاقات کی اور ''سرودِ نو'' ان سے طلب کیا۔ اس خواہش کے ساتھ کہ میں اس پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ کتاب ان کے پاس موجود نہیں تھی لیکن انہوں نے یہ فرمایا کہ میں مقالہ ضرور لکھوں۔ میں کمپنی باغ کے معروف بک سیلر کریم بخش کے یہاں گیا اللہ کے بندے نے ڈھونڈ کر ایک کاپی نکالی اور میرے حوالہ کر دیا۔

۱۹۶۷ء میں تحریر کردہ یہ میرا ایک بھرپور مقالہ تھا جسے میری اولین کوشش کہا جا سکتا ہے۔ ''اخترؔ قادری کی غزل گوئی'' اخترؔ قادری کی شاعری کے ایک پہلو پر تحریر کیا جانے والا یہ اولین مقالہ تھا جو پورے شرح وبسط سے لکھا گیا تھا۔ اس مقالہ کو ڈاکٹر عبد المغنی صاحب نے ماہنامہ ''مریخ'' جولائی ۱۹۶۸ء کے شمارہ میں شائع کیا۔

آبر احسنی گنوروی جیسے استادِ زمانہ شاعر نے اسے پسندیدگی کی سند عطا کی۔ ''مریخ'' اگست ۶۸ء کے شمارہ میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس مقالہ کی اشاعت کے ۱۶ ؍سال بعد میرا دوسرا مقالہ ماہنامہ ''مریخ'' مارچ ۱۹۸۴ء میں ''اختؔر قادری کی نظم نگاری'' کے زیرِ عنوان اشاعت پذیر ہوا۔ یہ دونوں مقالہ لکھ کر میں نے اپنے استاد کا حق نمک ادا کرنے کی کوشش کی۔ آج انہیں مقالوں کے چند اقتباسات آج کی نئی نسل کے سامنے دوہرانا چاہتا ہوں۔ عربی کا ایک مقولہ ہے کہ مَنْ تَعَلَّمَ حَرْفاً فَهُوَ مَوْلَاهُ۔ جس نے مجھ کو ایک حرف بھی پڑھا دیا وہ میرے لئے مولا ہو گیا۔ جب کہ اختؔر قادری صاحب کے سامنے میں نے دو برسوں تک زانوئے تلمذ تہہ کئے رکھا ہے۔

جب مجھ کو ''سرودِ نو'' دستیاب ہو گیا اور میں نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو میں نے صاف طور پر یہ محسوس کیا کہ یہ مجموعہ اردو کی اخلاق مندانہ شاعری کا ایک نمائندہ مجموعہ ہے۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ ہر چہار طرف اردو کے افق پر سرخ سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اختؔر قادری کی نصیحت آموز اور اخلاق مندانہ شاعری پر کون گھاس ڈالنے والا تھا؟ وہاب اشرفی نے ۱۹۶۲ء میں ماہنامہ شاعر بمبئی میں ایک مقالہ شائع کرایا تو اس میں بھی انہوں نے اختر قادری کو محض ایک صوفی شاعر قرار دیا یہ صوفیانہ شاعری دردؔ اور اصغؔر کے نام منسوب ہو چکی تھی پھر کسی دوسرے کی شبستاں میں اسے دیکھنا کون گوارہ کرتا؟ گرچہ قادری صاحب کا یہ احساس تھا ؎

اختؔر سخنوروں میں یہ چرچے ہیں آج کل
انداز فکر و فن کے تمہارے کچھ اور ہیں

واقعی اختؔر صاحب کا اندازِ فکر و فن دوسروں سے جداگانہ تھا لیکن انہیں قدر دانی نصیب نہ ہوئی ؎

کمالِ فن کی دنیا میں، نہیں کچھ قدر اے اختؔر
یہ جنسِ بے بہا ہے اک متاعِ رائیگاں اب تک

زمانہ ہر زمانہ میں کسی نہ کسی کی گرفت میں رہا ہے۔ اس زمانہ میں زمانہ پر ترقی

پسندوں کی گرفت مضبوط تھی۔ اس وقت اخلاق مندی کے برخلاف اخلاق باختگی قبول کی جا سکتی تھی۔ خدا ترسی کی بجائے خدا بیزاری فکر پسندیدہ تھی۔ پڑھائی لڑائی ساتھ ساتھ کا نعرہ لگایا جا رہا تھا۔ یہ لڑائی مال و جائیداد کی لوٹ پاٹ سے لے کر تمام ان انسانی خواہشات اور جذبات کی لوٹ پاٹ بھی تھی جو انسانوں کے اندر عرفانِ حق اور عرفانِ ذات کی کیفیات پیدا کرتی ہیں۔

ان حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ عصبیت، معاصرانہ چشمک، علاقائی تنگ نظری، باشندگانِ بہار کی پست ذوقی و کم ہمتی، صوبائی تعصب، ہم عصر ناقدوں کا معاندانہ جذبہ۔ یہ سب اخترؔ صاحب کی شاعری میں روگ بن کر لگ گیا۔ حالانکہ ان کی وجہ سے ان کی شاعرانہ حیثیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ البتہ یہ ہے کہ ہم لوگ مردہ پرست بن کر رہنا پسند کرتے ہیں اور زندگی میں ناقدری کرنے کا مزاج رکھتے ہیں۔ اس لئے قادری صاحب کے معاملہ میں بھی ہمارا یہی رویہ رہا۔ قادری صاحب کی بلندیٔ فکر و نظر سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ وہ اردو کے ایک بلند پایہ شاعر تھے یہ ایک پوست کندہ حقیقت ہے۔

اب آیئے ہم لوگ ان کی شاعری کے گلشن کی سیر کر کے سیر گلشن کا مزہ لے لیں۔ سرودنو میں غزلیں اور نظمیں دونوں موجود ہیں اور دونوں کے اندر دلکشی اور دلربائی پائی جاتی ہے۔ غزلوں میں تصوف بھی ہے اور تعبّد بھی۔ تعشق بھی ہے اور تلذذ بھی اور ان سب پر مستزاد ان میں تبسم بھی ہے اور ترنم بھی۔ گرچہ اول الذکر صفات کے مظہر اشعار کی تعداد قلیل ہے پھر بھی جو ہے وہ آپ اپنی مثیل ہے۔

جانے اس جلوۂ بے پردہ کا عالم کیا ہے
سو حجابوں سے بھی جس کی یہ ضیا آتی ہے

جہاں وہ جلوہ نما ہو سر نیاز جھکا
یہ قید دیر و حرم ہے مجاز بے بنیاد

میرے فلک کے چاند ستارے کچھ اور ہیں
میں جن میں محو ہوں وہ نظارے کچھ اور ہیں

☆

بھرم کھل جائے عالم پر کسی کی لامکانی کا
غنیمت ہے حریمِ دل نگاہوں سے نہاں ٹھہرا

اور اخیر میں سجدۂ شکر کے بطور یہ شعر ؎

جذبۂ بے اختیار شوق کام آنے لگا
ان کے دیوانوں میں اب میرا بھی نام آنے لگا

جہاں تعشق اور تلذذ کی بات ہے اس نوع کے اشعار قادری صاحب کی غزلوں میں بہ مقدار وافر ہیں۔ چند کی پیش کش پر اکتفا کرتا ہوں ؎

یہی منزل یہی حاصل ہے اخترؔ
کسی کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں

☆

بھری محفل میں خود کو اک تماشہ کر دیا میں نے
جو صورت بھی حسیں دیکھی قدم پر بڑھ کے جاں رکھ دی

☆

کہیں تڑپ نہ اٹھے آپ کا دلِ نازک
نہ سنئے سخت الم ناک ہے مری روداد

☆

کچھ ہم کہتے کچھ تم سنتے، کچھ تم کہتے کچھ ہم سنتے
تم اور کہیں ہم اور کہیں، پھر رام کہانی کیا کہئے

☆

جھجکے، کھنچے کھڑے ہوئے سن کر بیان شوق
پھر مسکرا کے بیٹھ گئے بانکپن سے دور

☆

اختر اس محراب ابرو کا تصور کیا کہوں
لذت سجدہ ملی، لطف قیام آنے لگا

☆

وفا خلوص محبت کے گوہرِ نایاب
کسی کی نذر کو میں لے چلا یہ سوغاتیں

☆

وفا اور اس بتِ بیگانہ آشنا سے امید
خیالِ خام میں اختر نے عمر کی برباد

☆

کہتے نہ تھے نہ کیجئے وعدہ نباہ کا
رسوا ہوئے خود آپ مجھے بھی مٹا دیا

یہ وہ اشعار ہیں کہ جن میں محبت کی مختلف کیفیات کا بیان ہے۔ یہ نہیں کہ اس قبیل کے اشعار صرف اسی قدر ہیں بلکہ ایسے اشعار اور بھی ہیں۔ عشق کا والہانہ پن ان میں موجود ہے۔ معصومانہ جذبات، شکوۂ جفا، تلاشِ محبوب میں در بدری کی کیفیت۔ کچھ رجوع اور رضا کے اظہار پر خواہشِ وصل کی اشتعال انگیزیاں، ٹوٹے ہوئے دل کا جنبشِ لب سے چھلک پڑنا۔ پھر ضبطِ غم کا مظاہرہ۔ محبوب کے دل نازک کے تڑپ اٹھنے کا اندیشہ۔ محراب ابرو پر فریفتگی کا عالم اپنی وفا شعاری کا اعلان و اظہار۔ یعنی اردو غزل کی تمام کیفیات کا بہ اندازِ دگر اظہار اختر صاحب کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ ہجر اور وصل کی اذیت کوشی اور لذت یابی کے مستزاد، خیال آرائی اختر کی شاعری کے لئے حیات بخش ثابت ہوئی ہے۔

فراقِ یار میں مر مر کے جی اٹھا کوئی
امیدِ وصل کی اللہ رے کراماتیں

اس امید وصل کے بطن سے اختر کے یہاں فکر کی ایک الگ دھارا نمودار ہوئی۔ یہ اختر کی اصل شاعری ہے، جو نظم نگاری کی شکل میں سامنے آئی ہے ان کی جھلکیاں غزلوں میں نظر آتی ہیں۔

نہ پوچھو خاطر ناشاد پر جو کچھ گذرتی ہے
کوئی جب پوچھتا ہے وجہ میرے یاس وحرماں کی
کسی نے آہ کی آنکھیں مری بھر آئیں دل تڑپا
مرے حصے میں آئی، سارے عالم کی عزاداری

سارے عالم کی اس عزاداری کی ذمہ داری اپنے پہلو بدل بدل کر جناب اختر قادری سے خدمت لیتی رہی۔

جو مستعد نہ ہو پیکار خیر وشر کے لئے
تو پھر فلاح کی صورت کہاں بشر کے لئے

☆

چلنا سکھایا میں نے جنہیں وائے انقلاب
ٹھکراتے ہیں وہی مجھے اب کج روی کے ساتھ

☆

گلزارِ جہاں میں محرومی انجام ہے کوتہ دستی کا
جو ہاتھ بڑھانے سے چوکا پھل پھول کچھ اس کا ہو نہ سکا

☆

اک قہر ہے دل کے لئے یہ سوزش پیہم
یوں جلنے سے اک بار ہی جل جائے تو اچھا

انسانیت کی شمع فروزاں کو کیا ہوا
یارب ضمیر حضرتِ انساں کو کیا ہوا

یہاں سے جو شاعری شروع ہوتی ہے وہ شرافت کی شاعری ہے۔ حسنِ اخلاق اور تعمیر کردار کی دعوت دینے والی شاعری ہے۔ ادب اور شائستگی کو پروان چڑھانے والی شاعری ہے۔ عرفانِ حق اور عرفانِ ذات کا شعور پیدا کرنے والی شاعری ہے۔ یہی وہ شاعری ہے جسے تعمیر پسند شاعری کہا جاتا ہے جہاں سے تخریب کا نام ونشان مٹتا ہے۔ عداوت ونفرت کا قلعہ قمع ہوتا ہے اور اسی سے تعمیر پسند ادبی تحریک کو قوت ملتی ہے اور دنیا میں خیر کا بول بالا ہوتا ہے۔

اختر قادری کی اس تعمیر پسندانہ شاعری کا کنسپشن ان کی نظموں میں نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ گرچہ ان کے یہاں ایسی نظمیں بھی موجود ہیں جن میں رومان کا عنصر غالب ہے لیکن ان کا اصل رنگ شاعری اور ان کا حقیقی نصب العین اخلاقی نظموں میں نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے ۔

یہ حسن بعد مکانی ترے فراق میں ہے
یہ سوزِ غم کی کہانی ترے فراق میں ہے
فریبِ عالمِ فانی ترے فراق میں ہے
ترا ہی ذکر تری چاہ آرزو تیری
ہر ایک دل میں سمائی ہے جستجو تیری
(ترے فراق میں)

یہاں سے اختر صاحب کی اسلام پسندی واضح انداز میں سامنے آتی ہے۔ اسی اسلام پسندی نے ان کے اندر تعمیر پسندی کو جنم دیا ہے ۔

بیانِ زلف ورخ، اشعار میں ڈھونڈھیں جو اے اختر
انہیں تو شاعری جزویست از پیغمبری کہہ دے

اس جزویست از پیغمبری کی شاعری کا اولین نمونہ ''مجاہد'' کی شکل میں سامنے آیا ہے ۔

آج پھر عالم پہ چھائی ہے گھٹا بیداد کی
اے مجاہد اٹھ ضرورت ہے تری امداد کی

(مجاہد)

دوسری شاہکار نظم ''یہ مانجھی'' ہے ۔

یہ دھان پان گل اندام نازنیں بانکے
کمر لچکتی ہے موجِ نسیم سے جن کی
مرے نصیب یہ مشکل کا وقت یہ مانجھی
کلیجہ جن کا دھڑکتا ہے شورِ طوفاں سے
ہم ہی ضعیفوں کو پتوار تھامنا ہے آج
کہ زن قماش جوانوں کا سامنا ہے آج

نئی نسل کی تعمیر کردار کے لئے ایک اور نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ۔

ہیں روزِ ازل سے یہی فطرت کے اشارے
جیتے نہیں جیتے ہیں جو اوروں کے سہارے
بڑھ بڑھ کے پہاڑوں کے قدم چوم رہے ہیں
تنکوں کو بہاتے ہوئے سیلاب کے دھارے
طوفاں کا نہ مانجھی کا نہ قسمت کا گلہ کر
لا کھینچ کے ساحل کو سفینے کے کنارے
جویائے گہر بازوؤں پر اپنے نظر کر
طوفاں تو سمندر میں نئی شئے نہیں پیارے

(اشارے)

اسی طرح ان کی نظم ''ایک انگارہ'' کے کچھ اشعار سنئے ۔

وہ نوجوان ہے ملت کی آنکھ کا تارہ
جو مستعد ہو بدلنے کو وقت کا دھارہ
جسے ہلا نہ سکیں آندھیاں حوادث کی
رکھے وہ فطرتِ فولاد و سیرتِ خارہ
جگر کے سوز سے جب تک نہ بہرہ ور ہو یقیں
تمام دفترِ دانش گماں کا پشتارہ
ہزار تودۂ خاشاک ایک انگارہ

(ایک انگارہ)

باطل کے تودۂ خاشاک کے لئے حق اس وقت ایک انگارہ بنے گا جب اس کے جوانوں کے اندر شیوۂ مردانہ پیدا ہوگا۔

شیوۂ مردانہ گیرودر صف جنگاہ شو
گر شباب زندہ داری، زود شو، ناگاہ شو

اختر صاحب اپنی اس دعوت کے بعد یہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی میرِ کارواں شباب زندہ رکھنے والوں کی قیادت کرتا ہوا آگے آگے چلا آ رہا ہے۔

مژدہ باد آتے ہیں اطلس کی قباؤں والے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑانا ہے جنہیں
حرم اس ظلم کی بستی کو بنانا ہے جنہیں
جن کی ہیبت سے لرزتے ہیں جفاؤں والے
آئے آئے تری حرمت کے نگہدار آئے
ناصرِ اہلِ وفا دافعِ اشرار آئے

''اطلس کی قباؤں والے'' کی صفت بھی شاعر کی نظر میں متعین ہے اس لئے شاعر پروردگار عالم سے دعا کرتا ہے۔

دلِ مرتضٰی عطا کر دل ابنِ مرتضٰی دے
وہی دل جسے صعوبت ہو عمل کا تازیانہ
وہ نگاہ! آدمی کو جو بنا دے آدمی پھر
وہ نگاہ جو بدل دے رہ و رسم عامیانہ

☆

غم جسے سمجھا ہے سازو برگ بیداری ہے وہ
غم کے پردے میں نظر آتے ہیں اسرارِ حیات
کثرتِ لمحات ہستی نیست وجہِ افتخار
غنچۂ پژمردہ را جنبش بہ ماند یادگار

(مطبوعہ: خصوصی شمارہ ''مجلّہ'' شعبۂ اردو، بی آر اے، بہار یونیورسٹی، مظفر پور)

☆☆☆

سہیل عظیم آبادی

خلوص کا پیکرِ جمیل

یادوں کی کتابوں میں سجا کر انہیں رکھے
سوکھے ہوئے پھولوں کا نظارہ بھی بہت ہے

دور طالب علمی میں لکھنے لکھانے اور چھپنے چھپانے کا جو شوق دل میں پیدا ہوا۔ ملازمتی زندگی میں داخل ہونے کے بعد اسے اور بھی جلا نصیب ہوئی۔۱۹۷۲ء میں ایک ذاتی ضرورت سے میں پٹنہ پہنچا تو سرِ راہے، ڈاکٹر وہاب اشرفی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ان کی قیام گاہ پر پہنچوں۔

دوسری صبح میں ان کی قیام گاہ پر پہونچا تو دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کئی احباب کے ساتھ چائے کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ سلام و آداب کے بعد میں چپکے سے بیٹھ گیا۔میرے سامنے بھی چائے کی ایک پیالی آگئی۔ گفتگو جو انتہائی پر کیف اور چھیڑ چھاڑ کے ماحول میں چل رہی تھی، چلتی رہی۔ میں بھی لطف اندوز ہونے کی نیت سے ہمہ تن گوش تھا۔ موضوع تھا۔جدید شاعری کا مستقبل۔

عمیق حنفی، عادل منصوری اور محمد علوی زیرِ بحث تھے اور ان کے بخیے ادھیڑے جا رہے تھے کہ میں درمیان میں کود پڑا اور عرض کیا کہ جدید شاعری ابھی راہ سفر میں ہے اس لئے یہ بات فیصلہ کن انداز میں نہیں کہی جاسکتی کہ اس کا مستقبل تاریک ہے۔ پھر اسی وقت ایک شعر پڑھا۔ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ کہا مظہر امام کا۔انہوں نے پھر سوال کیا۔مظہر امام کو آپ پہچانتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جانتا ہوں اور ہلکے پھلکے طور

پر پہچانتا بھی ہوں، ابھی یہ جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ ایک گورے چھریرے بدن کے آدمی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ لیجئے اچھی طرح پہچان لیجئے۔ مجھ کو فراق کا شعر یاد آ گیا ۔

تم مخاطب بھی قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

استاذی وہاب صاحب نے ہلکی سی چٹکی لی۔ ''مظہر صاحب کو ایک فین مل ہی گیا۔'' سب لوگ چلے گئے۔ ایک وجد آ گیں قہقہہ ہر طرف بلند ہوا اور مجلس برخاست ہو گئی۔ سب لوگ چلے گئے۔ میں بیٹھا ہی رہا۔ پھر جب محترمی وہاب صاحب سے گفتگو چھڑ گئی تو انہوں نے پے بہ پے سوالات کر ڈالے۔ ملازمت کس مرحلہ میں ہے؟ کتنا پیسہ مل رہا ہے؟ اور بھی دوسرے مسلم ملازم وہاں ہیں یا نہیں؟ شادی ہوئی کہ نہیں؟ اور آخری سوال تھا۔ ادبی سرگرمی کا کیا حال ہے؟ موقع غنیمت تھا۔ میں نے عرض کیا کہانی لکھنے کا جو ہنر میں نے سیکھا تھا اس کی حوصلہ افزائی آپ نے کی تھی۔ اب تمنا ہے کہ اپنی آرزو کو میں فضا میں اچھال دوں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہمت افزائی کی اور کہا آپ کل جا کر مظہر امام صاحب سے ملئے۔ اتنے ہلکے اور معمولی تعارف کے سہارے اتنی عظیم تمنا کی تکمیل کے لئے مظہر صاحب سے ملنا میرے لئے امر محال تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ ایک خط مجھ کو دے دیں۔ مگر انہوں نے میری ہمت بندھائی اور فرمایا کہ اس کی قطعی حاجت نہیں۔ آپ کل ضرور جائیے اور ان سے ملئے۔ استاد کا حکم تھا۔ دوسرے دن میں ریڈیو اسٹیشن حاضر ہوا۔ مظہر امام صاحب نے مسکرا کر میرا استقبال کیا تھوڑی سی ہمت بندھی۔ وہ کچھ لکھ پڑھ رہے تھے۔ ذرا رک کر انہوں نے میری خیریت دریافت کی۔ کچھ اور رسمی باتیں بھی ہوئیں پھر وہ اپنے کام میں لگ گئے۔ میں بار بار یہی سوچتا رہا کہ اپنے لئے کیسے منہ کھولوں۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ دیکھا۔ ایک اوسط قد، ادھیڑ عمر، گورا رنگ، چنچل چتون، کاکل نما بال، بال کے کچھ حصہ کو الجھائے سلجھائے ایک ہاتھ میں بیگ اور اسی بیگ کے اوپر کچھ کاغذ رکھے ہوئے ایک

صاحب کمرہ میں داخل ہوئے۔ مظہر امام صاحب جو ابھی منہمک تھے ہڑ بڑھا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ نو وارد نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھائی مظہر لو''۔ میرا اسکرپٹ دیکھ لو۔ میں تو وقت پر آ گیا۔ چلو کہاں چلنا ہے۔''

ارے نہیں، نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کی اسکرپٹ اور میں پڑھوں۔؟

''نہیں مظہر! تکلف بند کرو۔ دیکھو ہر چیز کا ایک اصول ہوتا ہے نا۔''

''جی وہ میں جانتا ہوں۔ لیکن آپ مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ بس چلئے''۔

''اچھا ایسا کرو۔ تم کوئی کام کر رہے ہو۔ بیٹھو میں ذرا.... مل آتا ہوں۔'' کئی نام تھے جو سب کے سب غالباً ریڈیو اسٹیشن کے وابستگان کے تھے۔ یہ کہہ کر وہ صاحب کمرہ سے باہر نکل گئے۔ میرا استغراق ٹوٹا۔ میں ذہن پر زور ڈالنے لگا۔ میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے۔ ابھی کمرہ سے وہ نکل کر چند قدم ہی گئے ہوں گے کہ پھر لوٹ آئے۔ ''اچھا ایسا کرو میں جا کر ریکارڈنگ کروا دیتا ہوں۔ اس لئے کہ اس کا وقت ہو گیا ہے۔''

مظہر صاحب اپنے کام میں مشغول رہے۔ میں سوچتا رہا اپنی بات مظہر صاحب سے کیسے کہوں؟ یہاں تک کہ اچھا خاصا وقت گذر گیا۔ مظہر صاحب کام سے فراغت پا کر مجھ سے ہم کلام ہوئے۔ میری تخلیقی سرگرمیوں کی بات نکلی۔ میں نے بھی اپنا مدعا ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ میری مقالہ نویسی کو پسندیدگی سے دیکھ رہے تھے اور میں انہیں جدید غزل کے امام کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا۔ کہ پھر وہی صورت سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''لو بھائی میں نے ریکارڈنگ کروا دی۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑے ہی رہے۔ مظہر امام صاحب بھی خود کھڑے ہو گئے تھے اور سراپا سپاس بنے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔ ''سہیل بھائی بیٹھئے ذرا ہم لوگ ایک ایک چائے لے لیں۔'' یہ سنکر میں ششدر رہ گیا۔ مجھ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ''سہیل بھائی''، جن سے ملنے کی تمنا ایک مدت سے دل میں سمائی ہوئی تھی آج اس طرح اتنا قریب سے مل جائیں گے۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر گذار ہوا۔ یہ سفر زندگی کا ایک یادگار سفر بن گیا جب محض اتفاق ہی اتفاق سے اپنی دو پسندیدہ ہستیوں سے

قربت اور ملاقات کا موقع نصیب ہو گیا۔

یہ بات ۱۹۷۲ء کی ہے۔ آج بھی پردۂ ذہن پر وہ منظر جیوں کا تیوں موجود ہے، جیسے ساری باتیں کل کی ہوں۔ مظہر امام صاحب نے آنے کے وقت کہا تھا کہ میں امداد امام آثر پر ایک مقالہ لکھ کر بھیج دوں۔ اسی سال کے اواخر میں میں اپنے مقالہ کی ریکارڈنگ کرانے جب دوسری بار ریڈیو اسٹیشن پہنچا تو مجھ کو کمرہ میں بیٹھا کر کسی کام سے باہر نکال گئے۔ میں اپنا مقالہ نکال کر پڑھنے لگا کہ۔

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

وہی ''سہیل بھائی'' پھر حاضر ہیں۔ میں جھٹ پٹ اٹھا سلام کیا اور کھڑا رہا۔ دریافت حال پر میں نے بتایا کہ مظہر صاحب ابھی ابھی دوسرے کمرہ میں گئے ہیں۔ سہیل صاحب بیٹھ گئے۔ کوئی کاغذ نکال کر دیکھنے لگے اور میں ان کی تصویر نگاہ کی راہ سے اپنے دل میں اتارنے لگا۔ دو منٹ بھی نہیں گذرا ہوگا کہ وہ مجھ سے گویا ہوئے۔

''کیا نام ہے بابو تمہارا''۔ جو پیار اس جملہ میں تھا۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔

جی! ظفر حبیب!

ظفر حبیب؟ تم کہانی لکھتے ہو!

جی! کبھی کبھی! اور میں نے ماہنامہ کتاب لکھنؤ میں آپ کے مراسلہ کا جواب بھی لکھا تھا۔ فوراً میں نے قربت کی راہ ڈھونڈی۔ لیکن ادھر سے کچھ اور ہی انداز تھا۔

کیا کرتے ہو!

معلّمی!

لیکن مولوی تو نہیں معلوم ہوتے ہو!

صورت سے تو نہیں ہوں

یعنی فطرتاً مولوی ہو؟

یہ بھی نہیں کہہ سکتا؟

یہاں کہانی پڑھنے آئے ہو؟

جی نہیں! مقالہ

ہاں! ہاں مقالہ ہی لکھا کرو۔ اس کی بہت ضرورت ہے۔ ایماندار تنقید نگار کہاں ملتے ہیں؟ جسے دیکھو کسی نہ کسی کھونٹے سے بندھا ہے۔ ایم اے کہاں سے کیا؟

مظفر پور سے!

او ہو۔ تم اختر قادری کے شاگرد ہو؟ بڑے اچھے آدمی ہیں بیچارے انہیں بھی لوگ بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ابھی شاید وہ کچھ اور کہنے ہی والے تھے کہ مظہر امام صاحب آگئے۔ سہیل صاحب نے کھڑے کھڑے ان سے چند باتیں کیں اور روانہ...... میرا سلام جب تک ان کا تعاقب کرتا وہ کمرہ سے باہر نکل چکے تھے۔ ابھی ہم لوگ بیٹھنے ہی والے تھے کہ وہ پھر حاضر ہوگئے اور مظہر صاحب کو کمرہ کے دروازہ تک لے گئے چند باتیں کیں اور چلے گئے۔

کئی برس بیت گئے۔ میں بار بار پٹنہ گیا۔ لیکن سہیل صاحب سے کہیں ملاقات نہیں ہوسکی۔ ایک شام پٹنہ ریڈیو نے۔ ''شری سہیل عظیم آبادی کو بہار اردو اکیڈمی کا سکریٹری بنادیا گیا'' کا اعلان کیا۔ میں نے انہیں مبارکباد کا خط لکھا پر کچھ دن بعد ملاقات کا شرف حاصل کرنے حاضر ہوا۔ معاملہ ہماری اسٹوڈنٹس اردو لائبریری لکھمنیاں کا تھا۔ جسے صف اول کی لائبریری کا مرتبہ دینے کے بعد دوسرے درجہ میں ڈال دیا گیا تھا۔ میں اکیڈمی پہنچا۔ سہیل صاحب اپنے کمرہ میں تھے اور تنہا تھے میں اندر گیا۔ انہوں نے خوش دلی سے مزاج پرسی کی اور ملاقات کی غرض دریافت کی۔ میں نے اپنی لائبریری کا مسئلہ رکھا۔ سہیل صاحب نے پوچھا اس لائبریری سے تمہارا کیا واسطہ؟ میں نے عرض کیا کہ میں اسی قصبہ کا باشی ہوں اور اسی لائبریری نے میرے اندر ہی نہیں مجھ جیسے بہت سارے لوگوں کے اندر علمی اور ادبی شعور پیدا کیا ہے۔ میں اس کا حق نمک ادا کر رہا ہوں۔'' ''اچھا تو آپ

لکھمنیاں کے رہنے والے ہیں‘‘؟ ’’جی‘‘

شمالی مونگیر کی یہ بڑی معروف بستی ہے۔ شرفا کی کثیر تعداد وہاں بستی ہے۔

جی! اور کمال تو یہ ہے کہ وہاں نسلی یا طبقاتی کشمکش نہیں پائی جاتی ہے۔ اس حیثیت سے ہمارا یہ قصبہ ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر میں نے حضرت شیخ سلطان صاحبؒ کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو بھی بڑی محبت ہے۔

سہیل صاحب نے انتہائی دلچسپی اور انہماک سے میری بات سنی۔ کرید کرید کر پوچھا کیسے لوگ ہیں؟ کیا معیار تعلیم ہے؟ معشیت کے ذرائع کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ آخر میں یہ بھی کہ میں کوشش کرونگا کہ آپ کی لائبریری پھر صف اول میں آجائے۔ جی شکریہ!

وقت کافی گذر چکا تھا۔ گفتگو ان کے لئے بھی دلچسپ تھی۔ باہر سے جھانک تاک کا سلسلہ جاری تھا۔ میں نے اجازت لی اور اپنے دل میں ان کی عقیدت کے قدموں پر اپنی نیازمندی کے پھول نچھاور کرتا ہوا اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔

جب بھی یہ باتیں یاد آتی ہیں تو سوچتا ہوں۔ سہیل صاحب کو ایک عظیم افسانہ نگار کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ پریم چند کی روایات کا پاسدار انہیں قرار دیا گیا۔ لیکن شاید ہی کسی نے ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر ان کے اس جذبہ کو دیکھا ہوگا جو ایک قصبہ کی محبت کی شکل میں میرے سامنے نمودار ہوا تھا۔

اس کے بعد میرا یہ معمول بن گیا کہ جب کبھی پٹنہ جاتا سہیل صاحب سے ضرور ملاقات کرتا۔ جب بھی ان سے ملتا وہ اسی پیار اور خلوص سے ملتے میں نے اسی خلوص سے متاثر ہو کر ان کے لئے یہ شعر کہا تھا ؎

چھلکے ہے ہر اک جنبش اظہار وفا سے　　انساں نہیں اخلاص کا پیمانہ لگے ہے

خلوص کے اس چھلکتے ہوئے پیمانہ سے میری ملاقات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ سہیل صاحب نے مجھ کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ مجھ کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اسی دوران میں میرے ماموں جان ابو محمد شبلی صاحب (لکھنؤ) سے سہیل صاحب کی مراسلت کا

سلسلہ دراز ہوا۔ سہیلؔ صاحب جب کبھی لکھنؤ جاتے شبلی صاحب کو اپنی آمد کی پیشگی اطلاع دیتے اور وہاں جا کر ٹھہرتے بھی۔ ان کی بیٹی طیبہ نسرین کو وہ اپنی بیٹی کا سا پیار دیتے۔ دوران ملاقات ایک بار وہاں میرا بھی نام آگیا۔ طیبہ نے بہت دن بعد، مجھ کو بتایا تھا کہ سہیلؔ صاحب نے کچھ تعریفی کلمات سے مجھ کو نوازا تھا اور ادبی میدان میں میری پیش قدمی پر اظہار اطمینان بھی کیا تھا۔ سب کچھ سن لینے کے بعد میرے ماموں جان نے بس یہ کہا تھا کہ وہ میری بہن کا بیٹا ہے۔ لیجئے یہاں سے سہیلؔ صاحب کی شفقت و محبت کا نیا دور شروع ہو گیا۔

سہیلؔ صاحب کی سادہ لوحی، خلوص اور انکسار کی کوئی ایک دو مثال ہو تو بیان کیجئے میری نظر میں تو وہ سراپا خلوص، سراپا انکسار اور مکمل سادہ لوح تھے۔ نریش کمار شادؔ نے شاید یہ شعر انہیں کے لئے کہا ہوگا۔

قدرت نے میرا جذبۂ اخلاص دیکھ کر
سارے گناہ کر دئے شامل ثواب میں

ایک ذکر اور سن لیجئے۔ میں سہیلؔ صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ لکھمنیاں کا ذکر چل نکلا۔ میں نے وہاں کی ادبی و شعری مجلسوں اور سرگرمیوں کا ذکر ان سے کیا۔ وہاں کے شعراء کا اجمالی تعارف کرایا۔ سہیلؔ صاحب نے پوچھا۔ آپ بھی ضرور شعر کہتے ہوں گے۔ میں نے اثبات میں دھیرے سے سر ہلایا۔ فرمانے لگے ''بھائی دیکھو شعر کہنا کوئی آسان کام نہیں۔ مجھ سے تو یہ کہ گاڑی نہیں چل سکی۔ پھر بھی میں اچھے اشعار پسند ضرور کرتا ہوں۔ اچھے شعر میں جو سحر آمیزی ہوتی ہے۔ میں اس کا کھلے دل سے قائل ہوں۔'' اتنا کہہ کر ایک شعر انہوں نے سنایا، جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ یہ شعر ان کے ستھرے اور بلند ذوقِ شعری کی نشاندہی کرتا ہے۔

وہ تو کہیئے جام ٹوٹا اور ہلچل مچ گئی
ورنہ ہر پتھر کا رخ تھا میرے ہی سر کی طرف

کہنے لگے دیکھو کتنی لطافت اور جاذبیت اس شعر کے اندر ہے۔ یہ اعتراف کرنا کہ شعر گوئی کا ہنر انہیں نہیں آتا اور ایک حقیر نوزائیدہ قلم کار کی ہمت افزائی کرنے کے لئے خود کی عظمت بیان کرنے کے بجائے اپنی کمزوری کا ذکر کرنے کا جذبہ سہیل صاحب کے سوا مجھ کو اور کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے بہت سے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں، یہاں تک کہ علماء اور نام نہاد بزرگوں سے ملاقات کی ہے۔ ان میں سے ہر کسی کی گردن مجھ کو تنی نظر آئی۔ بڑے تو بڑے ان گنت چھوٹ بھیّوں کو بھی اسی مرض میں مبتلا دیکھا ہے۔

مجھ کو شبلی صاحب اور سہیل صاحب کی ملاقاتوں کی اطلاع بہت بعد میں ملی تھی۔ اس سے پہلے ہی کا ایک واقعہ اور بھی لائق ذکر ہے۔ اکیڈمی کے دفتر میں ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''ارے دیکھو ظفر! تم لکھمنیاں میں کوئی ایسا پروگرام کرو۔ جس میں میں بھی شریک ہو سکوں۔ میرے دل میں لکھمنیاں کو دیکھنے کی تمنا ہے۔'' میں نے حامی بھر لی ۱۹۷۵ کی اسٹوڈنٹس اردو لائبریری لکھمنیاں کی سالانہ تقریب کے موضوع پر ہم لوگوں نے ایک شام افسانہ کے نام کا فیصلہ لیا۔ جس کی صدارت سہیل عظیم آبادی کے ذمہ رکھی۔ تیاری زور و شور سے چل رہی تھی۔ پورا علاقہ اس شام کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کہ یکا یک بھیانک سیلاب نے لکھمنیاں کو آگھیرا۔ ماہ ستمبر کے اواخر کا موسمی سیلاب۔ خلیج بنگال میں ضم ہونے کے لئے جاتی ہوئی گنگا کا پانی لکھمنیاں والوں کی مزاج پرسی کے لئے آدھمکا۔ سارا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ سہیل صاحب کی آمد اور ان کے استقبال کی منتظر لکھمنیاں والوں کی آنکھوں کے سامنے جل تھل کا منظر پھیل گیا۔ ان کی تمام آرزوئیں غرق گنگا ہو گئیں۔ ریڈیو اور اخبار سے یہ خبر سن کر سہیل صاحب متردد ہو گئے مجھ سے ملاقات ہوتے ہی انہوں نے پوچھا ''کہو کیا حال ہے لکھمنیاں کا۔ سیلاب نے زیادہ نقصان تو نہیں پہنچایا۔'' میں نے عرض نقصان تو بہت زبردست ہوا۔ آپ کے آنے کا پروگرام ملتوی ہو گیا۔ وہ مسکرائے

یار زندہ صحبت باقی

یار زندہ کی شرط ہے۔ ایک شرط ہے پچھلے برس تک جب وہ ہم لوگوں سے جدا ہونے

والے تھے یہی کہتے رہے کہ "میاں مجھ کو لکھمنیاں لے چلو، کیا پتہ زندگی وفا کرے نہ کرے۔ دیکھو میں دل کا مریض ہوں، گھبراؤ نہیں میں سادہ چپاتی اور ہری سبزی کھانے والا آدمی ہوں۔

میں نے چھوٹتے ہی کہا کہ آپ تاریخ طئے کر دیں میں آ کر آپ کو لے جاؤں گا اور انشاء اللہ اچھا پروگرام کروں گا۔ ہمارے یہاں کے خوش ذوق سامعین ہمیشہ اچھے پروگرام کی راہ دیکھتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے لمبے چوڑے طئے شدہ پروگرام کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا ذرا دور دراز کا سفر طئے کر کے آ جاتا ہوں تو پھر بلا تکلف کسی دن چل چلوں گا۔ ہم مان گئے ۔ لکھمنیاں میں شام افسانہ کے علاوہ برونی کالج میں جشن پریم چند منانے کا پروگرام طئے کر لیا۔ سہیلؔ صاحب کو دونوں ہی مجالس کی رونق بڑھانی تھی۔ لیکن سہیلؔ صاحب نے اس طویل سفر کے ضمن میں اس سفر کا ذکر نہیں کیا جو انہیں درپیش تھا۔ کرتے بھی کیسے؟ کسے معلوم کہ کب اس کے سفر کا رخ بدل جائے۔ اور وہ ابدالاباد دنیا کے سفر پر چلا جائے گا۔ ہائے امرت رائے۔ اب ہم کیا کریں؟ آپ پریم چند کے بیٹا تو ہو سکتے ہیں عاشق تو نہیں ہو سکتے۔ عاشق سہیلؔ عظیم آبادی تھے۔ جنہوں نے اپنی محبوب کے آستانہ پہنچ کر اپنی جان نچھاور کر دی ۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

(مطبوعہ ماہنامہ سہیلؔ، گیا۔ سہیل نمبر)

سہیل عظیم آبادی
(ناولٹ نویس)

سید مجیب الرحمٰن سہیل عظیم آبادی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو اردو زبان و ادب سے معمولی سی واقفیت رکھنے والے کے لئے بھی شنا سا ہے۔ سہیل عظیم آبادی مرحوم ان خوش نصیب لوگوں میں تھے جنہیں ان کی حیات میں ہی خوب خوب شہرت بھی ملی اور قدر و منزلت بھی نصیب ہوئی۔ ادبی دنیا میں اردو کے معتبر اور مستند افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں میں ان کا شمار ہوا۔ اردو کے اعلیٰ پایہ کے جریدے ان کی تخلیقات کو اپنے صفحات پر جگہ دے کر فخر سے گردن تان لیا کرتے تھے۔ فنکار ہمیشہ زمانہ کی ناقدری کا شاکی رہا ہے۔ اگر کسی فنکار نے اپنے زمانہ سے اپنا لوہا منوالیا ہے اور بلا خوف و خطر خود کو سکہ رائج الوقت بنالیا ہے تو یہ اس کی دیو قامتی کا ثبوت ہے۔ بلاشبہ اردو کہانوی ادب میں سہیل ایک دیو پیکر شخصیت کا نام ہے۔ ایسی حالت میں ان کے فکر و فن پر قلم آزمائی کی کوشش اپنے طالب علمانہ ذوق کی تسکین اور اس عظیم شخصیت سے اپنا رشتہ برقرار رکھنے کی تمنا کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

سہیل صاحب اردو کی ترقی پسند تحریک کے آدمی کہے جاتے تھے لیکن سیاسی طور پر وہ ہمیشہ کانگریس کے گرد و پیش نظر آئے۔ پریم چند سے انہیں گہری عقیدت تھی یہی وجہ ہے کہ کہاں سے کہاں ان کی روح نے اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے کے لئے پریم چند کی رہائش گاہ کو منتخب کرلیا۔ پریم چند کے طرز تحریر سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ لیکن پریم چند کے نظریات سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے:

> ”پریم چند کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان کو دوسرے افسانہ نگاروں کے ساتھ ایک صف میں کھڑا کرنا میرے خیال میں درست نہیں ان

کی حیثیت اردو افسانوں میں حقیقت نگاری کے جنم داتا کی ہے۔"

بلا شبہ افسانوں میں حقیقت نگاری کا تصور، پریم چند کی ذات سے وابستہ ہے ورنہ افسانہ کے معنی ہی غیر حقیقی شئے کا، دلچسپ اور حیرت انگیز اظہار سمجھا جاتا تھا۔ کسی بات کی سچائی پر اگر شبہ کرنا ہوتا تو لوگ کہتے "بھئی یہ حقیقت ہے یا افسانہ؟" بہ الفاظ دیگر افسانہ حقیقت ہو ہی نہیں سکتا یہ تو حقیقت کی ضد ہے۔ ایسی حالت میں پریم چند نے زندگی کے ہمدوش افسانہ کو لاکر کھڑا کر دیا یہ ان کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ سہیل صاحب کے نزدیک پریم چند کا یہی عظیم کارنامہ قابل التفات اور لائق تقلید ہے۔ میں اس وقت اس مسئلہ سے اعراض برت رہا ہوں کہ پریم چند کے افکار و نظریات کی چھاپ سہیل عظیم آبادی تھی یا نہیں؟ گرچہ سہیل عظیم آبادی پر لکھنے والوں نے آنکھ موند کر یہ اعلان کر دیا ہے کہ سہیل پریم چند کی سچی نقل (True copy) تھے حالانکہ میری نظر میں سہیل نے پریم چند سے حقیقت نگاری کے سوا اور کچھ نہیں لیا ہے۔

سہیل صاحب کی اس حقیقت نگاری کے ثبوت میں میں ان کے ناولٹ "بے جڑ کے پودے" کا تنقیدی جائزہ پیش کرنا چاہوں گا۔ ناولٹ دراصل ناول اور افسانہ کے درمیان معلق ایک تیسری صنف ادب ہے۔ جس میں ناول کی طرح پلاٹ، کردار، مکالمہ، پس منظر، مقصد حیات اور طرز بیان سب کچھ ہوتا ہے۔ پھر بھی اس میں وہ وسعت اور پھیلاؤ نہیں ہوتا جو کسی بھی اچھے ناول کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ جہاں تک پلاٹ کی بات ہے ناولٹ میں پلاٹ ہوتا ہے۔ کئی حیثیتوں سے ناول سے زیادہ رچا ہوا پلاٹ ہوتا ہے۔ البتہ کردار، مکالمہ اور پس منظر، مختصر اور حسب ضرورت ہی ہوتا ہے۔ اس کا دامن تنگ کرداروں کی پہلوداریوں کو حسب ضرورت جگہ دینے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مکالمہ کی گنجائش بھی کم ہی نکل پاتی ہے۔ پس منظر اور پیش بندی کے لئے تو اور بھی زمین تنگ ہو جاتی ہے۔ لے دے کر قلمکار کرداروں کے سہارے اپنا مقصد حیات اپنے مخصوص طرزِ بیان کی مدد سے پیش کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ اس طرح اس کا سمٹا سمٹایا پلاٹ اسے

طویل مختصر افسانہ کی صف میں لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا یہ ناولٹ گٹھے ہوئے پلاٹ کا ایک خوبصورت کہانوی پیکر ہے۔ جس میں انہوں نے دو لاوارث بچوں آرنسٹ اور نورا کی پرورش و پرداخت اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کیلئے پروش پانے والے لطیف جذبات کی انتہائی دلنشیں تصویر پیش کی ہے۔ آرنسٹ اور نورا دونوں نطفۂ ناتحقیق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مشن میں دونوں کی پرورش و پرداخت ایک بوڑھی انگریز خاتون مس گرین کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ دونوں بہت بچپن سے ہی ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ان کی محبت عاشقانہ انداز رکھنے کے باوجود جنسی لذت کی منزل تک نہیں پہنچتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے شادی کر لینے کی تمنا دل میں پالنے لگتے ہیں۔ لیکن اسی دوران میں اسی کرسچن مشنری میں رہنے والا ایک آدی باسی نوجوان نورا کا عاشق ہو جاتا ہے نورا اسے پسند نہیں کرتی ہے۔ جب آرنسٹ کو اس آدی باسی کرسچن مسٹر آرتھر کی اس حرکت کا علم ہوتا ہے۔ وہ آرتھر کو اپنا رقیب پاکر یہ چاہتا ہے کہ آرتھر اس حرکت سے بعض آجائے۔ لیکن معاملہ اس کے برخلاف یہ ہوتا ہے کہ مشن کا سربراہ بشپ آرنسٹ کو ہی آرتھر کی راہ سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔ نورا اور مس گرین دونوں کو اس بات کا صدمہ ہے۔ ارنسٹ بشپ سے بغاوت کر جاتا ہے۔ وہ خود مشن سے نکل کر ایک معزز وکیل مسٹر سنہا کے یہاں آجاتا ہے اور انہیں کے یہاں رہنے لگتا ہے۔ مسٹر سنہا ارنسٹ کو ایم اے کرنے کے لئے پٹنہ بھیج دیتے ہیں۔ بعد میں وہ نورا کو بھی اپنے یہاں بلا لیتے ہیں اور اسے پڑھنے کے لئے ایک دوسرے شہر بھیج دیتے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے طور پر مگن ہیں کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ مسٹر سنہا ان دونوں کے لئے فرشتہ رحمت بن کر سامنے آتے ہیں۔ لیکن دونوں کی محبت ایک دوسرا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ مسٹر سنہا مرنے سے پہلے ارنسٹ اور نورا کو مس سکرین کی موجودگی میں یہ بتا دیتے ہیں وہ دونوں مسٹر سنہا کی اولاد ہیں اور بھائی بہن ہیں۔

ناولٹ کا یہ چونکا دینے والا کلائمکس معصومیت اور ملکوتیت پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

گرچہ قاری اس کے لئے تیار نہیں ہے لیکن اسے اس انجام کو قبول کر لینا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں پاکیزگی ہے۔ شرافت ہے اور ایک طرح کا بڑپّن ہے۔ یہ دراصل کہانی کار کے اپنے تصور حیات کا مظہر ہے یعنی یہ پاکیزگی شرافت اور بڑپن سہیؔل صاحب کا اپنا خاصہ ہے۔

سہیؔل صاحب کہانی میں کہانی پن کے قائل ہیں اور اس ناولٹ میں کہانی اپنی تمام تر صفات کے ساتھ موجود ہے۔ پورا ناولٹ دلچسپیوں سے بھرا ہے۔ یہ دلچسپیاں صرف اس لئے ہیں کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب انسانی معاشرہ کا جیتا جاگتا منظرنامہ ہے۔ یہی وہ حقیقت نگاری ہے جو سہیؔل نے پریم چند سے حاصل کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں متضاد صنفیں غلط ڈھنگ سے ایک دوسرے کے قریب ہو جاتی ہیں۔ اسے عشق و عاشقی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ یہ عشق جنسیت تک پہنچتی اور وہاں پہنچ کر اپنا دم توڑ دیتی ہے۔ انجام کار دو جسموں کا اتصال ایک نئے جسم کے وجود کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یہ عشق کرنے والے اتنی مجال نہیں رکھتے کہ اس نوزائیدہ کو اپنا سکیں جو بالکل بے قصور ہوتا ہے اور اپنے گناہ کا بوجھ اپنے سر ڈھو سکیں۔ بلکہ اس کے برخلاف اپنے گناہ کی سزا معصوم اور بے قصور روحوں کو دے دیا کرتے ہیں۔ ارنسٹؔ اور نوراؔ ویسی ہی دو معصوم روحیں ہیں جو اپنے والدین کے گناہ کی سزا میں محتاجیوں سے بھرپور مشن کی زندگی گذارتی ہیں۔ اگر بروقت ان کی ملاقات مسٹر سنہاؔ سے نہیں ہوگئی ہوتی تو شاید یہ لوگ اس سے بھی زیادہ بھیانک انجام کو پہنچتے۔ ماں جایا، بھائی بہن ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بیاہ کرتے اور افزائش نسل کا کام انجام دیتے۔ سہیؔل عظیم آبادی فطرت انسانی (مسٹر سنہا جی) کے اس چھچھوراپن پر کاری ضرب لگانے کے ساتھ ساتھ عزم و حوصلہ پیدا کرنے اور اپنے گناہوں کی سزا میں خود جہنم رسید ہونے کا مزاج پیدا کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتانا چاہا ہے کہ جرم کی پردہ داری کتنا بھیانک روپ اختیار کر لیتی ہے۔ سہیؔل ایک انسان دوست فنکار تھے۔ علامہ اقباؔل کی طرح۔

برتر از گردوں مقام آدم ست
اصل تہذیب احترام آدم ست

یعنی آدمی کا مقام آسمان سے بھی بلند ہے اور اصل تہذیب، آدم کا احترام ہے کے قائل تھے۔ انسانیت جس رنگ و روپ میں بھی ان کے سامنے آئی اس کی انہوں نے قدر کی ڈاکٹر محمد محسن نے صحیح کہا ہے کہ ''سہیلؔ عظیم آبادی ایک عظیم افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔'' مشن والے لوگ گرچہ اپنے مذہب کی تبلیغ کیا کرتے ہیں۔ ان کی ساری بھاگ دوڑ کا ماحصل پریشان حال لوگوں کو تبدیلی مذہب کے لئے اکسانا یا کم ازکم اپنی تہذیب اور مذہب سے بیزار کر دینا ہوا کرتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہی سہی لیکن انسانوں کی خدمت کا جو مزاج ان لوگوں کے اندر پایا جاتا ہے سہیلؔ صاحب کی نظر میں وہ بے حد قابل قدر اور لائق تقلید ہے۔

سہیلؔ صاحب نے مدت تک جھارکھنڈ کے آدی واسیوں کے درمیان رہ کر اس کا مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے مشنری کے طریقۂ کار کو نزدیک سے دیکھا تھا۔ وہ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ انسان کے اندر کی انسانیت کو انسانیت کی شکل میں رونما ہونا چاہئے۔ ''ارنسٹؔ مس گرینؔ کے ساتھ بنگلے پر پہنچا۔ بنگلہ بہت بڑا تھا مگر مس گرینؔ اکیلی ہی رہتی تھی۔ اس کے پاس ایک کمرے میں مس منتورؔ رہتی تھی۔ وہ گونگے بہرے بچوں کا اسکول چلاتی تھی۔ ایک کمرہ میں مس وائلٹؔ رہتی تھی وہ لڑکیوں کے لئے دستکاری کا اسکول چلاتی تھی۔'' یہ سب کیا ہے صرف یہ بتانے کی کوشش کہ انسانیت کے لئے کام کرنا ایک ہمہ جہت کام ہے۔ سہیلؔ صاحب مستقل طور پر متحرک اور فعال رہنا ہی شیوۂ مردانگی سمجھتے تھے۔

اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

یہی پیغام تھا سہیلؔ صاحب کی زندگی کا۔

''سب کی سب دن رات اپنے کاموں میں لگی رہتی تھیں۔ صرف
چائے اور کھانے کے وقت ملاقات ہوتی تھی، ورنہ ایک بنگلے میں رہ

کر بھی ایک دوسرے سے اتنی دور تھیں جیسے الگ الگ محلوں میں رہتی
ہوں۔ بس خاص خاص موقعوں پر آپس میں مل کر بیٹھتیں اور مشورہ
کرتی تھیں۔''

یہ تھا ان کا آئیڈیل۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، کہ سہیلؔ صاحب ایک انسانیت دوست فنکار تھے۔ وہ تفریق مذہب وملل کے قائل نہیں تھے۔ جہاں انہیں اچھائی نظر آئی اس کی انہوں نے قدر کی۔ ترقی پسندوں کے قریب رہ کر بھی مذہب سے انہیں نفرت نہیں محسوس ہوئی۔ مذہبی گروہ اگر انسانی بھلائی کے کاموں میں لگا ہوا نظر آیا تو انہوں نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

''مسٹر سنہا بہت سی باتیں کہتے رہے...... عیسائی مشنریوں کی
تعریف کرتے رہے۔ یہ کیسے اچھے لوگ ہیں جو اپنی ساری زندگی
ایک کام کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور اپنے لئے کچھ نہیں کرتے۔''
''مس گرین جب آئی تو لڑکیوں کے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اس
وقت اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن پڑھانے کے کام میں
اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ وہ ایسا کام کرنا چاہتی تھی جسمیں سارا دن الجھی
رہے اور نئے عیسائی بنا سکے۔''

سہیلؔ صاحب کی نظر میں یہ لوگ صرف اس لئے قابل قدر تھے کہ ان کے مقاصد نیک تھے اور نیک مقاصد میں مذہب پسندی بھی شامل ہے۔ امتیاز مذہب وملت سے وہ اوپر تھے۔ ہر مذہب کا ماننے والا ان کی نگاہ میں یکساں قدر ومنزلت کا حامل تھا۔ کسی کے لئے نہ ان کے دل میں خصوصی التفات تھا اور نہ کسی کے لئے مخصوص مراعات یہ ان کے کردار کا مومنانہ پن تھا یہ سیکولرزم نہیں تھا۔

مسٹر سنہا کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ:

''سارے رشتہ دار ان کی آزاد خیالی سے نالاں تھے اور کوئی ان کے
یہاں آتا جاتا نہیں تھا...... ان کے نوکر مسلمان تھے، عیسائی تھے،
آدی باسی تھے اور ان کے رشتہ دار ہندو تھے۔ سب کو اپنا مذہب پیارا

تھا۔ مسٹر سنہا کی طرح بے ذات اور بے مذہب بننا پسند تھا۔"

یہ اقتباس مذہب پسندی کے نام پر مروجہ نفرت پسندی پر گہری چوٹ ہے۔ ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

سہیل صاحب اس مقولہ کے قائل تھے۔ انسان آدم کی اولاد اور اللہ کا بندہ اور عیال ہونے کی حیثیت سے تفریق، تعصب اور آپسی تصادم کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

ناولٹ کی محدود بساط پر کردار نگاری کا جوہر دکھانے کے مواقع کم ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر فنکار فنی چابک دستی کا مظاہرہ نہ کرے تو پلاٹ میں سقم پیدا ہو جائے گا۔ سہیل صاحب سے اس سلسلہ میں ذرا بھی چوک نہیں ہوئی ہے انہوں نے چادر دیکھ کر پیر پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ کرداروں پر اتنا ہی جچا تلا تبصرہ بھی کیا ہے جس سے بات بھی بن گئی اور فن بھی مجروح نہیں ہونے پایا۔

"ارنسٹ نے دل ہلکا محسوس کیا۔ اس کی دو ہی تمنائیں تھیں۔ ایک ایم اے کرنے کے بعد کسی کالج کا لکچرر بننا اور دوسری نورا سے بیاہ کرنا۔..... "اس نے خود کو ایسا پودا محسوس کیا جو کھلتا جا رہا تھا، مگر جس کی جڑ کہیں نہیں ہوتی۔ ایسی بیل کی طرح جو دوسرے پیڑوں پر پل جاتی ہے اور اس کی جڑ کہیں نہیں ہوتی۔" ایسے تراشے جملوں کے ذریعہ اجمال میں تفصیل کو جگہ دے دینا سہیل صاحب کی فنکارانہ صلاحیتوں کی غماز ہے۔

سہیل صاحب کے جملے چھوٹے اور ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ جس طرح جملوں کو توڑ توڑ کر اور لفظوں کو اچھال اچھال کر وہ گفتگو کرتے تھے وہی انداز انہوں نے اس ناولٹ میں بھی اختیار کیا ہے۔ پھر بھی اس کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ کوئی قاری جب اسے شروع کر دیتا ہے تو اسے ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ کہانی میں ڈوب جانا اور ڈوب کر خود کو کھو دینا۔ سہیل صاحب کے دلنشیں اسلوب کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ بلاشبہ اس ناولٹ کی تخلیق کے لئے وہ ہمیشہ قدر و استحسان کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

☆

(مطبوعہ سہیل نمبر۔ ہفتہ وار پندار۔ پٹنہ)

شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری

شکیلہ اختر کی ایک درجن کہانیوں کا مجموعہ ''لہو کے مول'' بہار اردو اکیڈمی کے تعاون سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا ۱۹۳۶ سے ۱۹۷۶ تک تیس برس کا ایک سفر ہے جس کے دوران شکیلہ اختر کی چھ کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ان میں ''تنکے کا سہارا'' جو ایک ناولٹ ہے کو چھوڑ کر باقی سب کے سب افسانوی مجموعے ہیں اس وقت میرے پیش نظر ان کا آخری افسانوی مجموعہ ''لہو کے مول'' ہے۔ جس کی بنیاد پر میں ان کی افسانوی صلاحیت اور حیثیت پر ایک دیانتدارانہ نگاہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میں شکیلہ اختر پر اس وقت سے کچھ لکھنا چاہ رہا تھا جب میں ایم اے کا طالب علم تھا اور ان کا افسانہ ''لہو کے مول'' ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اس کہانی کو پڑھ کر آج سے مدتوں پہلے مجھ پر جو کیفیت گذری تھی اس کا مزہ اب بھی منہ میں باقی ہے۔ میرے نزدیک اس مجموعہ کی کہانی پر اظہار خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عبدالمغنی جیسے نقاد نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا ہے:

> ''پریم چند کی بنائی ہوئی مختصر افسانہ نگاری کی روایت کو پروان چڑھانے میں شکیلہ اختر کا کارنامہ ناقابل تردید ہے۔ بلاشبہ وہ ایک مسلم الثبوت مقتدر اور مستند افسانہ نگار ہیں۔''

کیوں اور کیسے........؟ یہ بات محتاج تشریح ہے۔ میں یہاں اسی اجمال کی تفصیل بیان کرنا چاہوں گا۔

کسی بھی فن پارہ پر گفتگو کرتے وقت اس کی فنی کسوٹی کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ ورنہ رخش فکر کی بے زمامی گمرہی کا سبب بن جاسکتی ہے۔ افسانہ کے ساتھ سب سے بڑی

ٹریجڈی یہ ہے کہ اب تک اس کی کوئی مکمل اور جامع تعریف نہیں کی جاسکی۔ لیکن یہی اس کا سب سے خوبصورت پہلو بھی ہے۔ افسانہ نگار افسانہ کی تعریف کو پیش نظر رکھ کر افسانہ نہیں لکھتا بلکہ وہ لکھتا ہے اور لکھتا چلا جاتا ہے۔ تعریف خود بخود پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اس کا اشہب فکر جس سمت کو اختیار کر لیتا ہے وہی سمت آنے والی نسلوں کے لئے قابل قبول بن جاتی ہے۔ لیکن یہ قبولیت ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ ایسے خوش نصیب لوگ دنیا میں کم ہیں۔ شکیلہ اختؔر انہیں کمیاب قلم کاروں میں سے ایک ہیں۔ وہ پریم چند کی مقلد نہیں پریم چند کی طرح اس کی راہ کی ایک راہی ہیں جنہیں آگے چل کر راہبر ہونے کا شرف حاصل ہو گیا ہے۔

شاعری تنقید حیات ہے لیکن افسانہ تنقید حیات نہیں تشریح حیات ہے۔ افسانوں میں زندگی کے بخیوں کا ادھیڑا جانا اتنا دلنشیں عمل ہے کہ اسے بار بار دہرانے کے بعد بھی اس کا نیا پن اپنی جگہ جیوں کا تیوں برقرار رہتا ہے۔ ہم آئے دن ایسے مواقع سے دو چار ہوتے ہیں جو نا قابل فراموش ہوا کرتے ہیں۔ کبھی ان میں دلچسپی بھری ہوتی ہے تو کبھی تلخی۔ مشام جاں کو معطر کر دینے والے واقعات بھی دلکش ہوتے ہیں اور روح کو کرب میں مبتلا کر دینے والے واقعات بھی۔ لیکن روح کا نچوڑا جانا، اس سے قطرہ قطرہ لہو کا ٹپکنا اور اس کی ٹپک اور تپک سے لطف اندوز ہونا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ جسے یہ لذت ملی، وہ یادگار بن گیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ میں یہ تسلیم نہیں کرتا:

"شکیلہ اختر نے پریم چند کی بنائی ہوئی مختصر افسانہ نگاری کی روایت کو پران چڑھانے میں نا قابل تردید کارنامہ انجام دیا ہے۔"

بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ گلزار افسانہ نگاری میں شکیلہ اختؔر نے ایک اور خوبصورت تختہ کا اضافہ کیا ہے اور گلزار کی وہ خوبصورتی ہر گل را رنگ و بوئے دیگرست میں مضمر ہے۔

ہمارے گردو پیش آئے دن ان گنت واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یا تو وہ سب کے سب نا قابل توجہ ہیں یا پھر سب کے اندر ذہن سے چپک جانے کی صلاحیت موجود

ہوتی ہے۔ دنیا کے ایک عظیم ملک کا صدر گولی (امریکی صدر جان کینیڈی) سے اڑا دیا جاتا ہے دنیا میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے لیکن اسی زمانہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جن کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی سی غریب بچی بس سے کچل کر مر جاتی ہے اور کوئی شخص اس سے متاثر ہو کر صفحات کے صفحات سیاہ کر دیتا ہے۔ انسانی نفسیات کی ایسی ایسی گرہیں کھولنا شروع کر دیتا ہے کہ کرشمہ دامن دل می کشد۔ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ انسان اور انسان کی محسوسات میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی ذکی الحس ہوتا ہے تو کوئی بودا اور شقی القلب۔ شکیلہ اختر ایک ذکی الحس خاتون ہیں جنہوں نے گرد و پیش کی معمولی معمولی باتوں سے بھی اثر قبول کیا ہے۔ اور اسے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ لکھنے کا انداز اس قدر دیانتدارانہ ہے کہ ان کے افسانوں میں اس سے خود بخود ایک دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ سبی باجی ایک دولت مند خاتون ہیں جو کھانے کے لئے جیتی رہی ہیں لیکن کھانا نے جب خود ان کے وجود کو کھانا شروع کر دیا تب وہ تائب ہونے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن ہوس نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ چرمری، چٹ پٹی غذاؤں کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں سے پانی ٹپکنے لگتا۔ معاشرے کی یہ ایک تصویر ہے اور اسی معاشرے میں کنور بھی ہے جو "دس برس کی سوکھی ماری، پھٹی پھٹی آنکھوں والی ایک لڑکی ہے جس کے کمزور کاندھوں پر تین تین جان کو کما کر کھلانے کی ذمہ داری ہے۔ جسے ان تین معصوموں کو توے کا چاند دکھانے کے لئے میلوں میل کا سفر روزانہ کرنا پڑتا ہے۔ جو حقیر سی مزدوری پر اپنی محنت بیچنے کو تیار ہے اور بار بار سبی باجی اور شہلی سے استدعا کر رہی ہے کہ وہ لوگ اس کے لئے ان داتا بن جائیں۔ سبی باجی کو اس کا احساس بھی ہے کہ یہ دس سال کی معصوم بچی، جس کے سوکھے جسم پر تین کلبلاتے ہوئے بچے چمٹے ہوئے تھے، وہ ان کے لئے کھانے کی تلاش میں کیسی سرگرداں تھی، کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہی تھی لیکن وہ اسے سہارا دینے کی بجائے تھوڑا چاول، آلو، کچھ پرانے کپڑے اور پانچ روپے دے کر خوبصورتی سے ٹال دیتی ہیں۔ حالانکہ خود سبی باجی کا اب جی یہی چاہتا تھا کہ وہ کہیں ایسی جگہ چلی جائیں

جہاں کھانے کا حسن اور آرائش انہیں نظر نہ آئے اور وہ اس سوکھے مارے ماحول میں رہ کر مجبور ولا چار اپنے جسم کا بوجھ اتار پھینکیں۔'' اسی کے لئے وہ ''بڑی آرزوؤں کے ساتھ اپنی سب سے چھوٹی بہن سے ملنے کو سرحد پار کرکے آئی تھیں۔'' لیکن شدید افسوس کی بات تو یہ ہے کہ بورڈر کراس کرتے ہوئے ان کو بڑی حیرت ہوئی تھی کہ دونوں ملکوں کی مٹی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ زمین ویسی ہی تھی، آسمان بھی وہی اپنا پرانا آسمان تھا اور صدیوں پرانے درختوں کی گھنیری ٹھنڈی چھاؤں ممتا سے بھری ہوئی تھی اور فضا میں بس ایک ہی سی خوشبو رچی بسی ہوئی۔ سبی باجی نے اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر ٹھنڈی سی سانس لی جو آزادی سے اڑتے پھر رہے تھے۔ ادھر سے اُدھر......! یعنی ساون کے اندھے کو ہر جگہ ہریالی نظر آئی۔ ممتا سے بھری درختوں کی گھنیری ٹھنڈی چھاؤں اور فضا میں رچی ہوئی خوشبو سے تو انہیں واسطہ پڑا لیکن کنو بس کسی طرح ٹال دیئے جانے والی شئے سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ اس طرح افسانہ نگار نے کرب میں پھنسی پوری دھرتی پر پھیلی انسانیت کی سچی عکاسی بھی کی ہے اور ابن آدم کو لکیروں میں قید کر دینے کے حادثہ پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ افسانہ نگار کا یہی انداز کتاب کے آخری افسانہ ''لہو کے مول'' میں بھی نظر آتا ہے۔ سرحد پار کا ملک بنگلہ زبان بولنے والے غریبوں کا ملک ہے جہاں بچے پھلتے ہیں، جہالت کی کھیتی ہوتی ہے، افلاس کا ننگا ناچ ہوتا ہے۔ اور اس مثلث میں اخلاقی اقدار ہمت مردانہ اور مسرت لازوال کے مقبرے بنے ہوئے ہیں۔ مناف میاں ایک ناکام و نامراد آدمی ہیں۔ جو اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے سارے اپائے کر چکنے کے بعد اپنا کھیت بھی گروی رکھ چکے ہیں۔ کاندھے پر میلی سی چادر رکھ کر دل میں ایک خوبصورت کشتی، مچھلی مارنے کا ایک جال، دو بیگھہ زمین اور ایک چھوٹا سا ندی کنارے کا مکان کی تمنا لے کر کمشنر صاحب کی کوٹھی میں داخل ہو گئے ہیں۔

پہلے کوٹھی کی چمک دمک سے انہیں گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن چکنا چلبلا سا سرونٹ کوارٹر دیکھ کر ان کے دل میں سوئی ہوئی جنت کی تمنا جاگ اٹھتی ہے اور وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ کمشنر صاحب کے احاطہ میں چپکے سے داخل ہو جاتے ہیں۔ سونے سے سرونٹ

کوارٹر میں بہار آجاتی ہے۔ کمشنر صاحب کو، ان کی بیوی اور بچوں کو سہارا مل جاتا ہے۔ کوٹھی کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔ لیکن مناف میاں کی دوسری بچی نجمہ کے بس سے کچل جانے کے بعد نقشہ بدل جاتا ہے۔ کمشنر صاحب پانچ ہزار روپیہ بس والوں کو خوں بہا کے طور پر دینے کو کہتے ہیں۔ اور موت کا غم پانچ ہزار کے تصور میں ایسا مدغم ہو جاتا ہے کہ پھر مناف میاں خوبصورت خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ حقیقت کا اتنا ننگا اظہار کر کے شکیلہ اختر نے اپنی فنکارانہ عظمت کا جو ثبوت فراہم کیا ہے۔ بلاشبہ یہ خاصے کی چیز ہے۔

افسانہ نویس سے کردار نگاری کی توقع تو نہیں کی جا سکتی لیکن اشارتی کردار نگاری کے مواقع سے فائدہ اٹھانے میں جس چابکدستی کی ضرورت ہوتی ہے شکیلہ اختر کے یہاں وہ چابکدستی نظر آتی ہے:

> ..... ''انورہ نے ایک محدود دائرے میں نجمہ کے بھولے پن پر پہرہ بٹھا دیا تھا۔ تہذیبی قدروں کی کوئی بندھن اس کی غربت اور فاقہ کشی بھری زندگی میں نہ آئی تھی۔ اس گھر میں آکر کبھی کبھی بے بی کے پرانے کپڑوں میں اس کا جی الجھا الجھا لگتا تھا.... انورہ جب بھی نجمہ کو آیا یا نوکرانی بنانے لگتی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے، اور وہ بلک بلک کر کہتی۔ ہونہہ اتنا اچھا کپڑا پہن کر بھی نوکرانی بنیں گی...... مٹی اور پانی سے لت پت ہو کر نجمہ نے بہت دنوں کے بعد خوشی کی ایک لمبی گہری سانس کھینچی۔''

یہ جملے نجمہ کے کردار پر بھرپور تبصرہ ہیں بلاشبہ یہاں (بقول کلیم الدین احمد) شعر مفرد کا لطف آتا ہے۔ اسی طرح یہاں مناف میاں کی تصویر بھی قابل دید ہے:

> ''بچے تو پیدا ہوتے اور مرتے ہی رہتے ہیں کسی کے مرنے کی قیمت کب ملی ہے۔ مناف میاں کا دل خدا کا شکر اور صاحب کے احسان سے بھر جاتا ہے...... مناف میاں ہنسی خوشی اپنے خاندان کے

ساتھ زینے سے اترتے چلے گئے۔ سیڑھیوں پر سے دھما دھم بچے
کودتے پھاندتے ہوئے اتر رہے تھے۔ بیگم صاحبہ کی کھوئی نگاہیں
دور خلا میں جیسے نجمہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ دور سے مناف میاں کے
خاندان کی مسرت بھری آوازیں آ رہی تھیں۔"

یہ ہے اس دیش کے بسنے والوں کی تصویر جس کے متعلق خود افسانہ نگار نے لکھا ہے:

"یہ ہے ندیوں، دریاؤں، مچھلیوں اور اوپر تلے ان گنت بچوں کی
پیدائش کا دیش۔ پاتھا بھات، بھونی ہوئی کچی پکی مچھلیاں اور روتے
بھنکتے بچوں کی قطاریں۔ بس یہی تو یہاں کی زندگی تھی اور یہ تو داتا کی
دین تھی کہ جھولیاں پھیلائے بنا چھپر پھاڑ کر گودیاں بھرتی چلی جاتی
تھیں۔"

یہاں یہ بھی واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ شکیلہ اختر نے ان پس ماندہ لوگوں کو اپنا موضوع اس لئے نہیں بنایا کہ یہ کوئی ترقی پسند ادیبہ ہیں۔ یہ ان کے ماتھے پر زبردستی کا لیبل چسپاں کر دینے کی بات ہوگی۔ بات صرف اتنی ہے کہ شکیلہ اختر ایک ذکی الحس خاتون ہیں جن کے سینے میں ایک فنکار کا دل دھڑکتا ہے۔ "ڈائننگ" اور "لہو کے مول" کے علاوہ "خش بختا" "چار کوردار ساڑیاں" اور "گز بھر کفن"۔ یہ تین افسانے بھی اسی قبیل کے ہیں۔ لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ تینوں کے کردار کا نفسیاتی ڈھانچہ ایک دوسرے سے قطعی جدا گانہ ہے۔ خش بختا افلاس زدہ ہے۔ گھر سے ملازمت کرنے کے لئے نکلتا ہے اس کا دل ماں کی محبت سے معمور ہے۔ لیکن بیگم صاحبہ کو ذرا بھی اس کا احساس نہیں ان کی نگاہ میں غربت انسان کو انسانیت کے جرگہ سے نکال کر بے حس، بے فکر اور بے زبان جانوروں کی ٹولی میں ڈال دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب خوش بختا عید کے کپڑے اور مدتوں سے سینچ کر رکھی ہوئی اپنی تمام چیزیں خوشی خوشی ماں کے قدموں میں نچھاور کر کے دوبارہ اپنی مالکن کے یہاں لوٹتا ہے تو بیگم صاحبہ اس کی ہمت افزائی کرنے، اس کی سعادت مندی کی داد دینے اور

اسے خوش آمدید کہنے کی بجائے اسے ''ماں کا جایا، کمبخت، کمینہ اور منحوس'' کے خطابات سے نوازتی ہیں۔ ''چارکوردار ساڑیاں'' کا میگھن ایک جوان، کنواری، گدرائی حسینہ کو بازوؤں میں بھرلینے کی تمنا دل میں لئے لئے اس عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ جب

''اس کی آنکھوں کے کونوں میں جھریاں سمٹ آتی ہیں۔ آگے کے کئی دانت بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور اس کے قد اور بدن میں جھکاؤ اور ڈھیلا پن بھی آجاتا ہے''۔

''گز بھر کفن'' میں بھی سماج کی شدید معاشی نابرابری کی دلدوز، دردناک، بھیانک اور سچی تصویر ہے۔ ڈاکٹر مائر کے کتے کو جو غذا ملتی ہے، اسی ڈاکٹر کی نوکرانی اس سے محروم ہے۔ اس کتے کے مقبرے پر لکھا ہے۔ ''ہماری محبتوں کا چراغ اس اندھیرے میں بجھا ہوا ہے۔'' اور اسی مقبرے کے صحن میں ایک چھوٹی بچی اپنی ماں کی گود میں پڑی ہے اور اس کی ماں چیخ کر کہتی ہے:

''ہائے رے میری سجادی بیٹی! تورے ایک گج کفن بھی نہیں ملا۔''

یہاں جوش ملیح آبادی کا ایک مصرع دوہرا دینا کافی ہوگا ؎

جز خدا اس ظلم کو برداشت کرسکتا ہے کون؟

معاشی نابرابری کی اس سچی تصویر کو اتنا جذباتی رنگ دینا شکیلہ کا طرۂ امتیاز ہے..... شکیلہ اختر جذبات نگاری ہی نہیں نفسیات نگاری میں بھی طاق ہیں۔ ''قرار'' کی بڑی بہو جوانی میں بیوگی کا شکار ہوجاتی ہے۔ زندگی کی تمام تر لذتوں پر اس کے لئے پہرہ بٹھا دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اس کا دیور رنڈوا ہونے کے بعد پھر سے شادی کرلیتا ہے۔ ہندو سماج نے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان جو تفریق روا رکھا ہے اس پر بھرپور طنز کے ساتھ ساتھ ایک عورت کی چاہنے اور چاہے جانے کی شدید تمنا، اس تمنا کی عدم تکمیل کی صورت میں کربناک تشنگی کا احساس اور سراب سے واسطہ ایک عورت کو کس موڑ پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔ اس کا اندازہ اس افسانہ میں لگایا جاسکتا ہے۔

نفسیات نگاری کے نقطۂ نظر سے شکیلہ کے افسانے ''پوپی'' اور ''باسی بھات'' اپنی معراج کو پہونچے ہوئے ہیں۔ عورت بچہ پیدا کرنے کی مشین نہیں لیکن تخلیق کار بنے بغیر اس کا وجود ایسا نامکمل ہے اور تشنگی کا ایسا مرقع ہے کہ جس کے انگ انگ سے کرب کے سوتے پھوٹتے ہیں اور شعلے لپکتے ہیں ۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں

یہ شرف جو خالق ارض وسمانے اسے عطا کیا ہے، اگر کوئی عورت اس شرف سے محروم رہ جائے تو درد کا کیسا سلگتا پیڑ بن جاتی ہے اس کا نمونہ اوما کی زندگی ہے ۔

زندگی اپنی جو اس رنگ میں گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالبؔ کے اس شعر میں جو رچا بسا Pathos ہے وہی Pathos شکیلہؔ کے افسانہ ''پوپی'' میں نظر آتا ہے۔ پوپیؔ ایک تمثیل ہے جو اوماؔ کی تشنگی بجھانے کا ذریعہ بنا ہے لیکن اس کی تشنہ تقدیر کا علاج نہیں بن سکتا ہے۔ شاید یہ شکیلہؔ کے ذاتی کرب کا خوبصورت عکس ہے اس لئے کہ تیر نیم کش کی خلش کا اندازہ تیر کھانے والے ہی کو ہو سکتا ہے۔ دوسرا تو اس خلش سے واقفیت کے لئے اس زخمی سے پوچھنے کا محتاج ہے۔

''اوما کے جسم کی گرمی میں پلے کو شاید اپنی ماں کی ممتا مل رہی تھی۔''

پلے کو ممتا ملے یا نہ ملے لیکن اوماؔ کے دل میں ممتا کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ:

''بالکل غیر ارادی طور پر اوما دھیرے دھیرے بچے کا ننھا سا سر سہلاتی رہی اور پھر اس کے لبوں پر آپ ہی آپ کوئی نغمہ مچلنے کو بے قرار ہونے لگا۔ نغمہ؟... اوما نے دل کے اندر اٹھتی ہوئی جب اس پکار کو

روکا، جب اپنی روح کی اس پیاسی طلب کو کچلا تو بے اختیار اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں اور پھر اس کے ہونٹوں سے کسی لوری کی جگہ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کی ایک کراہ ٹکرا کر رہ گئی..... آنکھوں کی پتلیوں سے لے کر سر سے پیر تک سیاہ رنگ کا چھوٹا سا نرم نرم بچہ جب اوما کو دیکھ کر خوشی کے مارے اچھل اچھل پڑتا تو اس کے پیار کو دیکھتے ہوئے اوما کا دل مسرتوں سے بھرپور ہو جاتا تھا...... اس کے تصور میں بھی پھول مسکرانے لگتے اور پھر وہ اپنے خیالوں میں منہمک ہر ایک نقش و نگار میں تیزی سے رنگ بھرنے لگتی۔''

ایسا ہونے کی وجہ یہ تھی:

''اوما کا ایک خوبصورت گھر تھا جس میں اس کا شوہر ہریش تھا....... سسرالی خاندان کے بہت سے پیارے پیارے بچے بھی تھے مگر اس جگمگاتی ہوئی دنیا میں وہ ایک دم اکیلی تھی..... اوما کی زندگی جس تپتے ہوئے سنسان صحرا میں گذر رہی تھی اس کو اوما کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ دریا کے ساحل پر کھڑی ہو کر بھی وہ پیاسی تھی۔ اس کی تمناؤں کی ساری کلیاں اس کے غم کی آنچ سے جھلس چکی تھیں فطرت نے جیسے اس کی زندگی کو خوشیوں، مسرتوں اور پیار میں سے کچھ بخشا ہی نہ ہو۔ اوما دراصل ایک تھکی ہاری عورت تھی۔ جس کی محبت اور چاہت کو کبھی کوئی سہارا نہیں ملا تھا اور جو اپنے دل کی پیاس مٹانے کے لئے اب تک گرم ریتوں اور پر سراب ہی کی طرف دوڑتی رہی تھی مگر قسمت نے اس کے تلووں میں چھالوں کی ٹیس کے علاوہ اور کچھ نہ دیا تھا۔''

''اب اس کا جی ساری دنیا سے اچاٹ ہو کر مرنے کی تمنا کرنے لگا
تھا۔ مگر اب کتے کے اس چھوٹے سے پلّے کو پا کر اوما کو ایک ہلکی سے
تسکین مل گئی تھی۔ یہ کوں کوں کرتا ہوا بچہ صرف اس کا اپنا تھا۔'' لیکن
''پوپی کتے کا صرف ایک چھوٹا سا بچہ تھا اور وہ اس حقیقت پر تلملا کر رہ
جاتی۔ اس کے من کے اندھیرے میں روشنی کا کوئی چراغ کبھی جلا ہی
نہ تھا۔''

اور اس کرب کی انتہا تو اس وقت نظر آتی ہے جب اوما پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی کہتی
ہے..... ہریش۔ پوپی بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا'':

یہ بات ہریش سے اس لئے کہتی ہے کہ ہریش اس کا غم خوار اور غم گسار بن سکتا تھا
لیکن اسے:

''ساری دنیا اور ساری انسانیت سے اتنا پیار تھا کہ ایک اکیلی لڑکی پر
توجہ دینے کی اس کو کبھی فرصت بھی نہ ملتی تھی۔ جہاں وہ ساری دنیا کو
سنوارنے کا تصور کر رہا ہو وہاں ایک بے چاری اوما کے معصوم دل کی
سنسان گلیوں کو کیسے گلزار بنا سکتا تھا۔''

ہریش اور اوما دونوں شریک زیست اور شریک سفر ہونے کے باوجود فکر کے قطبین
پر کھڑے تھے جس کے اتصال کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی اور جس کے مابین اوما کا وجود
جھولے کی طرح جھول رہا ہے۔ ایک طرف ہریش یہ سمجھتا تھا کہ ایک عورت کو کسی پیار کرنے
والے، ناز اٹھانے والے، ہمیشہ توڑتے اور مروڑتے رہنے والے، دھول دھپا اور اٹکھیلیاں
کرنے والے مرد کے بجائے:

''آرام پہونچانے والے گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ
رفتہ رفتہ اس سے الگ ہوتا چلا گیا۔''

اس کی زندگی اور اس کی ساری امنگوں سے دور ہو کر اپنے آپ کو کھوتا چلا گیا اور وہ مطمئن تھا

کہ آسائش کی زندگی میں تشنگی کا احساس ہی کیوں ہونے لگا حالانکہ:

"اوما ہریش کی ٹھنڈی آنکھوں میں اپنے لئے کسی جذبے کا اظہار نہ پاکر تڑپ سی جاتی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا کہ راکھ کے اس ڈھیر میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ بنا کر رکھ دے۔"

لیکن اوما بہرحال ایک عورت ہے جس کے جوہر کی نمود مرد کے ہاتھوں کی محتاج ہے۔ اس لئے وہ اپنے اندرون میں دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ نہیں بنا پاتی ہے البتہ اندر اندر تمام عمر سلگتی رہتی ہے۔ اور "تب اوما کو محسوس ہوا کہ وہ ایک دم اکیلی رہ گئی ہے۔" اس طرح اوما کے کردار کی پیش کش میں شکیلہ نے جس جزئیات نگاری اور عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے وہ صرف شکیلہ کا اپنا حصہ ہے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نفسیات نگاری میں شکیلہ اختر کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ تاثر کی وحدت سے مملو یہ افسانے شکیلہ اختر کو اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ایک ممتاز اور ممیز مقام عطا کرتے ہیں۔

(مطبوعہ ماہنامہ زبان وادب۔ پٹنہ خاص نمبر ۱۹۸۰ء)

عبدالصمد تپش کی شاعری

کہا جاتا ہے کہ تنقید، ادب کے لئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح زندہ رہنے کے لئے سانس۔ اس کے بغیر نہ تو ادب کی تخلیق ہوسکتی ہے۔ نہ قارئین کا وہ حلقہ پیدا ہوسکتا ہے جو شعروادب کی تفہیم و تحسین کی قدرت رکھتا ہو۔ ایک شاعر جب کوئی شعر لکھ رہا ہوتا ہے تو یہ تخلیقی عمل اس کی وجدانی مجبوری ہوتی ہے۔ قدرت کی جانب سے اسے وہ ملکہ عطا ہوتا ہے کہ اپنے مشاہدات، محسوسات اور جذبات کو پیکر حروف عطا کرتا ہے۔ قصر الفاظ تعمیر کرتا ہے۔ لیکن اس کی تسکین جذبات کی شانہ بہ شانہ اس کے اندرون میں یہ خواش بھی کروٹیں لینے لگتی ہے کہ اس کے اشعار سنے جائیں۔ پڑھے جائیں، سمجھے جائیں اور اسے داد تحسین حاصل ہو۔ چنانچہ مشاعرہ بازی کا شوق اور نشر واشاعت کی آرزو اسے نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ حسب توفیق وہ حوصلہ جب ایک شاعر اپنا کچھ قاری پیدا کر لیتا ہے اور کچھ سامع سے وہ داد وصول کر لیتا ہے تب جا کر تنقید کی نظر اس پر اٹھنے لگتی ہے۔ ناقد دراصل تخلیق کی راہیں، ہموار کرتا ہے اور تخلیق کار کے اندر جذبۂ تخلیق کو پیدا کرنے، نمو پذیر کرنے، استحکام عطا کرنے اور احساس ذمہ داری کو فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سب سے اہم کام ہے بشرطیکہ کسی تخلیق کار کا جائزہ تخلیق کار کی موجودگی ہی میں اس کے ہوش وحواس میں رہتے ہی لیا جائے۔ اردو تنقید نے اب، بعد از مرگ کی رسم کو توڑتے ہوئے عالم بہ قید حیات میں کرنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ اس راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہیں۔ اول یہ کہ زیر مطالعہ تخلیق کار کس عہدہ اور Status کا ہے اگر وہ کوئی حقیر فقیر ہے تو پھر اس پر کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ اگر وہ کوئی صاحب عہدہ وسفارش ہے تو پھر حق گوئی دم دبا کر بیٹھ جاتی ہے اور اگر شہ کا مصاحب ہے تو پھر زمین و آسمان کا قلابہ ملانے کا ہنر سامنے آتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ اگر کسی

باحیات تخلیق کار پر کچھ لکھنے لکھانے کی بات ہوتی ہے تو معاً یہ خیال عام ہو جاتا ہے کہ لکھنے والا یا تو خوشامدی اور کاسہ لیس ہے یا پھر اسے سات پشتوں کا بدلہ چکانا آتا ہے۔ اس طرح کسی بھی حال میں اس کی رائے اور اس کے فیصلے کو غیر جانبدارانہ نہیں تسلیم کیا جاتا۔

اس راہ میں وہ اساتذہ بھی حائل ہو جاتے ہیں جو اکثر محض صدر شعبہ ہوتے ہیں اور بزعم خود عقل و دانش کا پٹارہ۔ وہ کسی زندہ تخلیق کار پر کوئی تخلیقی مقالہ لکھنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ اب ایسے حالات میں تنقید کون کرے؟ کیا حالات کے سامنے سپر ڈال دے؟ یا اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی مہم شروع کرے۔

راقم الحروف اس آخری الذکر فیصلہ کا قائل ہے۔ اس کے سامنے میتھو آرنلڈ کا یہ قول ہے کہ:

> ''دنیا میں جو بہترین باتیں معلوم ہیں یا سوچی گئی ہیں۔ انہیں غیر جانبدارانہ طور پر جاننے اور عام کرنے کی خواہش کا نام ہی تنقید ہے۔''

یہ غیر جانبداری ہے کیا؟ نور الحسن نقوی کے الفاظ میں تنقید کے لئے غیر جانبداری کو بہت اہم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ معاملہ نہایت سنجیدہ ہے کہ ایک حساس انسان ہی اچھا تنقید نگار ہو سکتا ہے اور احساس کے لئے غیر جانبداری ضروری نہیں۔ اس لئے تنقید نگار کی کسی نظریئے سے وابستگی قابل اعتراض نہیں جو چیز ضروری ہے وہ خلوص ہے۔ یعنی جب وہ کسی کارنامے کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھے تو ادب اور فن کی طرف اس کا رویہ مخلصانہ ہو۔

مندرجہ بالا پیش بندی میں نے اس لئے کی ہے کہ مجھ کو جس شاعر کے کلام پر آئندہ سطور میں کچھ لکھنا ہے اور اس احساس ذمہ داری کے ساتھ لکھنا ہے کہ جانبداری کا میل فکر کے آنچل کو میلا نہ کرے۔ حالانکہ یہ مرحلہ میرے لئے مشکل ہے۔ اس لئے کہ جو شاعر زیر مطالعہ ہیں وہ میرے مربی ہیں۔ سرپرست ہیں۔ جس خانوادہ کے افق پر وہ ضوفشاں ہیں اسی گھر کا میں بھی چشم و چراغ ہوں۔

صالحہ عابد حسین جب ''یادگار حالی'' لکھ رہی تھیں تو ان کے سامنے بھی یہ مشکل پیش آئی تھی کہ انہیں اپنے نانا کی سوانح حیات مرتب کرنی تھی انہوں نے اس مشکل کا ذکر یوں کیا:

''یہ میں جانتی ہوں کہ یہ کتاب کسی بڑے ادیب کو لکھنی چاہیے تھی۔
لیکن چونکہ انہوں نے اس کام کو نہیں کیا۔ اس لئے میں نے فرض کفایہ کے طور پر اس کو اپنے ذمہ لیا۔''

میں یہ نہیں کہتا کہ جناب عبدالصمد تپش کی فکروفن پر کسی بڑے ادیب کو لکھنا چاہئے حالانکہ کئی نامور شخصیات نے جناب تپش کی شاعرانہ اہمیت وحیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن کئی ایسے لوگ جو ان کی شاعری برسہابرس سے سن رہے ہیں اور سر دھن رہے ہیں انہیں اس کا خیال نہیں آیا کہ وہ اپنا فرض ادا کریں۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو آج میری مشکل بہت آسان ہوگئی ہوتی۔

عبدالصمد تپش اس شاعر کا نام ہے جس نے تقریباً چالیس برسوں سے خود کو شغل شاعری سے جوڑے رکھا ہے۔ یہ ایک لمبا عرصہ ہے۔ ایک شاعر اگر اتنی لمبی مدت تک فکرسخن کرتا رہے تو یقیناً یہی ایک بات کافی ہے جس کی بنیاد پر اسے ایک سچا اور پکا شاعر کہا جائے۔ لاریب تپش ایک سچا شاعر بھی ہے اور پکا شاعر بھی ہے۔

شاعری کیا ہے؟ مشاہدات، جذبات اور احساسات کو دلفریب انداز میں پیکر الفاظ عطا کرنا ہے۔ شاعر جو کہتا ہے وہ کوئی عام طور پر انجانی بات نہیں ہوتی، جو کچھ شاعر دیکھتا ہے۔ عین اسی وقت انگنت آنکھیں وہ سب کچھ دیکھتی ہیں۔ دیکھنے والوں کے دل میں بھی کچھ نہ کچھ جذبات بیدار ہوتے رہتے ہیں لیکن شاعر ایک الگ مخلوق ہے جو اس مشاہدہ سے شاید تاثیر قبول کرتا ہے اور جو جذبات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں انہیں وہ اثر انگیز اظہار عطا کر دیتا ہے بس کیا ہے۔ وہی خیال جب اس کی زبان سے سننے والے سنتے ہیں تو سر دھنتے ہیں، پڑھنے والے پڑھتے ہیں تو عش عش کرتے ہیں۔ یہ اظہار پاٹ دار ہے تو بے

اثری کا شکار ہے اور اگر اظہار کاٹ دار ہے تو پھر مت پوچھئے کہ الفاظ دل کی گہرائی میں نہ جانے کہاں تک اترتے چلے جاتے ہیں۔ شاعری اسی مرحلے میں آکر شاعری بنتی ہے اور شاعر کو شاعر بنا دیتی ہے۔

عبدالصمد تپش کی شاعری کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں کھلی نظر سے تماشائے اہل کرم دیکھنے اور نظارۂ عالم پر نظر کرنے کی کیفیت موجود ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''زخموں کے سلسلے'' اس حیثیت سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ اور اب یہ دوسرا مجموعۂ کلام ''متاعِ آئندہ'' تحسین وصول کرنے کی غرض سے نذر قارئین کیا جانے والا ہے۔

تپش کے یہاں تمام مشاہدات عامہ موجود ہیں۔ ایک صاحب نظر کی طرح شاعر نے دنیا کی ہر شئے نظر ڈالی ہے اور اس سے جذباتی اثر قبول کیا ہے۔

وہ موضوع جس کا تعلق جوانی سے ہے یا جسے رومان پسندی کہتے ہیں وہ بھی ''متاع آئندہ'' کی غزلوں میں موجود ہے اور اس وقت جب کہ وہ ملازمت سے سبکدوشی کے آخری مہینوں سے گذر رہے ہیں اور اس وقت بھی اپنے اس احساس سے انہیں محبت ہے۔ وہ اسے اپنے مجموعہ میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ عمر کا تقاضہ اس سے دامن بچا کر نکلنے کا تقاضہ کر رہا ہے ؎

اپنے دل کو زباں پہ رکھتا ہوں
بس یہی ایک ہے ہنر اپنا

☆

مری چشم تر پہ نظر کبھی
مرے آنسوؤں میں اتر کبھی
ذرا جھالروں میں تو آنکھ کی
یہ سجاکے دیکھ شرر کبھی

یہ فراق کے ہیں پہاڑ دن
یہ پہاڑ ہو جو ادھر کبھی

☆

نظر سے جب میں اوجھل ہو گیا تھا
ترا رومال بوجھل ہو گیا تھا

☆

دامن بھی ان کا بھیگ چلا ہے مری طرح
ان تک یہ میرا دیدۂ تر کون لے گیا

☆

اتراتی ہے لے لے کے ہر اک گاؤں کی گوری
الفاظ میں گوندھی ہوئی سوغات کی خوشبو

یادوں کے دریچے سے کھڑی جھانک رہی ہے
اک ساتھ گذارے ہوئے لمحات کی خوشبو

☆

پھول سے چہرے پہ حالات رقم مت کرنا
میں چلا جاؤں تو رومال کو نم مت کرنا

☆

کھڑکی نہ کھول شوق کو پھر سے ہوا نہ دے
پھر مجھ کو آرزو کا نیا سلسلہ نہ دے
تجدیدِ وعدہ کرنے کا یہ سلسلہ نہ رکھ
بے وجہ مجھ کو روز کا یوں جاگنا نہ دے

میں نے گفتگو تپش صاحب کی رومان پسندانہ شاعری سے شروع کی ہے۔ صرف اس لئے کہ میں نے اس جہاں سے سرسری گذر جانا چاہا۔ اس ایک پہلو کے علاوہ تپش کے اس مجموعہ میں ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا کی کیفیت موجود ہے جو دل ونگاہ کا مرکز اولین بننے کی دعوت دے رہا ہے۔ جناب تپش نے اپنی شاعری کا تعارف خود کرایا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی ہے ؎

میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے
وہ سب حرف آئندہ ہے

☆

پھل دار درخت کل یہ ہوگا
میں حرف خیال بو رہا ہوں

☆

وہ بزم دیدہ وراں ہو تو اتنا کر دینا
مری غزل کا کوئی انتخاب رکھ دینا

☆

ہو نہ ہو کل یہ تعلّی کا صحیفہ ٹھہرے
اپنے حالات تپش خود سے رقم مت کرنا

☆

لفظ ومعنی کی نئی سوغات رکھ دینا تپش
پھر قلم سے تم اچھوتا ذہن وتیور بانٹنا

☆

وقت کے دامن میں کوئی
اپنی ایک کہانی رکھ

فن کا اپنے تو بھی تپشؔ
نقش کوئی لاثانی رکھ

☆

ہے معجزۂ فن کہ خیالات کی خوشبو
ہر بات میں ملتی ہے نئی بات کی خوشبو

☆

میرا لکھا ہوا سند ٹھہرے
فن کا ایسا کمال دے مجھ کو
طے کریں لوگ مجھ سے سمت سفر
اس قدر تو اُجال دے مجھ کو

حرف خیال بونے والے تپشؔ کو یہ احساس ہے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سب حرف آئندہ ہے۔ اس لئے اس کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ لفظ ومعنی کی نئی سوغات پر غزل میں رکھ کر اچھوتا ذہن وتیور تقسیم کرے۔ اس کی یہ آرزو بھی ہے کہ وہ وقت کے دامن پر اپنی ایک کہانی لکھ جائے اور دنیا کے سامنے اپنے فن کا لاثانی نقش چھوڑ جائے۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ اس کا لکھا ہوا سند ٹھہرے اور اس کے نقوش قدم دیکھ کر آنے والی نسل اپنا سمت سفر طے کرے۔ لیکن یہ سب کچھ لکھنے کے ساتھ ساتھ اسے یہ خوف بھی ستا رہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی شاعری اس کی آرزو کا پیکر نہ بن سکے اور اس کے سارے دعوے تعلّی قرار پائیں۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم اس کتاب کے اوراق پلٹنا شروع کرتے ہیں تو اس نوع کے اور بھی بہت سارے اشعار پر نگاہ جا ٹھہرتی ہے ۔

جہاں تک پاؤں میرے جا سکے ہیں
وہیں تک راستہ ٹھہرا ہوا ہے

☆

بس اتنا ہے کہ اپنی شاعری میں
میں اپنے دور کی فرہنگ رکھوں

☆

تپشؔ کا حال جو لکھنا تو بس یہی لکھنا
وہ خون دل سے رقم واردات کرتا رہا

☆

وہ حرف حق جو زباں تک نہ آسکا تھا کبھی
تپشؔ اسی کا مقدر بنانا چاہتا ہے
تپشؔ کے شعروں میں خون جگر بھی شامل ہے
تپشؔ کے شعر کبھی بے اثر نہیں ہونگے

☆

ترجمانِ وقت تھا میں، میں حقیقت آشنا
میں زمانے کو نئی فکر و نظر دیتا رہا

جناب تپشؔ اپنے دور کی فرہنگ اپنی بیاض میں رکھنا چاہتے ہیں، ترجمان وقت بننا چاہتے ہیں۔ زمانے کو نئی فکر و نظر دینا چاہتے ہیں۔ اور حرف حق کو زبان عطا کرنے کے آرزومند ہیں اور ان تمام کاموں کے لئے وہ غزل کی صنف کو کام میں لانا چاہتے ہیں اس لئے وہ زبان کی سادگی کے قائل ہیں مگر کاٹ دار الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

غزل کے فن میں نزاکت ہے اس کو دھیان میں رکھ
غزل کا شعر کبھی التہاب میں مت لکھ

☆

زباں سادہ ہے لیکن فکر و فن کا
تپشؔ کے شعر سے جادو جگا ہے

زباں سلیس تخیل لطیف سہل انداز
یہ ہوں تو شعر دلوں کی زبان رکھ دے گا

☆

اشعار میں تپشؔ کے تھیں تہداریاں بہت
لیکن بذات خود وہ بڑا سادہ شخص تھا
ان کی تحریروں میں ایسی کاٹ تھی کہ الاماں
بات کرنے میں تپشؔ لیکن بہت سنجیدہ تھے

☆

غزلوں میں میں نے اس کو نگینہ بنادیا
جو لفظ مدتوں سے پڑا صیدِ زنگ تھا

تپشؔ نے اپنی شاعری میں ان تمام امور کا لحاظ رکھا ہے اور جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جن کے ثبوت آئندہ عبارات میں دیکھئے۔ پہلے تپشؔ کے اس دعویٰ کو نگاہ میں رکھ لیجئے کہ تپشؔ نے یہ سب کچھ بطور خود کیا ہے، ذوقِ مشق و مہارت سے کیا ہے۔ اس کے لئے اس نے دریوزہ گری اور کاسہ لیسی نہیں کی۔

کسی کا اس نے تتبع کبھی کیا ہی نہیں　　تپشؔ کا اپنا ہی انداز اپنا لہجہ ہے

اس کے علاوہ جناب تپشؔ نے یہ احتیاط بھی رکھی ہے

پست معیار ہوگئی دنیا
اس کے معیار پر نہ جاؤں میں

☆

پست معیار سامعین میں تپشؔ
لے کے عرض ہنر نہ جاؤں میں

اس طرح شاعر صرف اپنی پہچان کی فکر میں نہیں ہے۔ بلکہ پہچان بنانے کی خاطر

پست معیاری قبول نہیں کرتا ہے۔ نہ جذبات سے مغلوب ہو کر ہنر کو بالائے طاق رکھتا ہے اور نہ وقتی شہرت کے ہر اوندھے سیدھے سامع یا قاری سے واہ واہی اور تالیوں کی وصولی کا کاروبار کرتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی کج کلاہی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے ہمیں تپش کی شاعری ہمہ رنگ نظر آتی ہے کبھی وہ صاف گوئی، اور بے باکی پر اتر آتا ہے تو عزم و حوصلہ کا داعی بن جاتا ہے۔ اس مرحلہ میں اگر وہ زمانہ کی بدحالی اور حالات کی زبوں حالی کا ذکر کرتا ہے تو رہبروں کی رہزنی اور لوٹ کے چرچے بھی اس کی شاعری کا عنوان بنتے ہیں۔ ایسی شاعری میں روح عصر صاف جھلکتی ہے ؎

کوئی کالم نہیں ہے حادثوں پر
بچا کر آج کا اخبار رکھنا
کٹانا سر پڑے جب حق کی خاطر
تپش تم مرکزی کردار رکھنا

☆

میرا قاتل بہت بزدل تھا لیکن
یہ اپنا ہاتھ ہی شل ہو گیا تھا
شرافت کا لبادہ اس کے تن پر
کسی دکھیا کا کمبل ہوگیا تھا

☆

کوئی سائے کا خواب کیا دیکھے
ہر شجر بے نقاب لگتا ہے

☆

تمازت حرص کی حد سے بڑھی ہے
سمندر خود ہوا ہے تشنہ لب لکھ

کوئی پتھر اٹھاتا بھی تو کیسے
درختوں کے ثمر اچھے نہیں تھے
مجھے معلوم تھا دن سخت ہوگا
کہ آثار سحر اچھے نہیں تھے

☆

درندے شہر میں بسنے لگے ہیں
سڑک ہے ہر طرف خوں ناب لکھنا
سفینہ ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے
نگاہوں میں ہے بس گرداب لکھنا

☆

جو ہو رہا ہے تماشہ بس اپنی آنکھ سے دیکھ
ہے روح عصر مسلسل عذاب میں مت لکھ

☆

ستم یہ ہے نگہبانوں کی بستی
بنی ہے شعلہ سامانوں کی بستی
چتا کی طرح چھپر جل رہے ہیں
کہ جیسے ہو یہ شمشانوں کی بستی
ہوئی شرمندہ چنگیزی روایت
جو دیکھی اس نے ویرانوں کی بستی

☆

کچھ تو اپنی ذات کو کر معتبر
کچھ تو اپنی ذات کی پہچان رکھ

وہ میرے حال پر روتا بہت ہے
مگر وہ زخم بھی بوتا بہت ہے
وہ جرم قتل کی تفتیش میں ہے
مگر دامن کو خود دھوتا بہت ہے

☆

تمہارے شہر کا کیوں اعتبار جاتا رہا
تمہارے شہر میں کیوں کوئی معتبر نہ بچا

☆

جاگے گی جو مخلوق تو انصاف چلے گا
پھر کوئی زمانے میں ستم گر نہ بچے گا

☆

جس کی محافظت پہ کیا میں نے اعتبار
وہ بھی تو سب کے ساتھ مجھے لوٹنے میں تھا

☆

پھر اسی کعبہ کی جانب ہیں رواں اصحاب فیل
اے خدا اب پھر ابابیلوں کو کنکر بانٹنا

☆

منبر و محراب سے آتش فشاں ہوتے تو ہیں
وقت کی دہلیز پر دستار رکھ جاتا ہے کون
یہ مرا ذوق سفر ہے ورنہ ایسی دھوپ میں
ہر قدم پر اک شجر چھتنار رکھ جاتا ہے کون
مری طرح سے نہ حق بات تم کہو دیکھو
بلا کا سایہ مرے آس پاس کیسا ہے

ظلم سہہ لینے سے شہ ملتی ہے ظالم کو تپشؔ
ہر کس و ناکس کو یوں قاتل نہ ہونے دیجئے

☆

اب فقیہ شہر بھی چلتی ہوا کے ساتھ ہے
وقت کی دہلیز پر خود اپنا سر لے جائے ہے

یہ اور اس طرح کے اس سے زیادہ اشعار تپشؔ کے یہاں موجود ہیں جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ تپشؔ کی شاعری فکر کو بیدار کرنے اور جذبۂ عمل کو متحرک کرنے کا کام بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ عام مشاہدات کو پوری احتیاط اور اہتمام سے شکل شاعری عطا کرنا تپشؔ کا اہل علم قارئین اور باذوق سامعین سے ہمیشہ داد و تحسین وصول کرتے رہنا ہے۔

عبدالصمد تپشؔ کی شاعری کا ایک رنگ خدا ترسی، اسلام پسندی اور انسان دوستی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے پند و نصیحت کی باتیں بھی کی ہیں حب رسولؐ کے جذبات کا اظہار بھی کیا ہے اور عبادت گزاری کی دعوت بھی دی ہے۔ اس نوع کے کئی اشعار طربناک اور جرأت انگیز ہیں کئی اشعار میں غضب کی دلچسپی اور دردمندی ہے اور کہیں کہیں تو دل کو چھو کر گذر جانے والے نصیحت آمیز اشعار بھی ہیں ؂

حرف حق لایزال دے مجھ کو
جرأت بے مثال دے مجھ کو
میں سفینہ ہوں جرم و عصیاں کا
بحر رحمت میں ڈال دے مجھ کو
اپنے محبوب کی محبت میں
سب سے آگے نکال دے مجھ کو
آرزو ہے تپشؔ کی بس اتنی
انؐ کے روضے پہ ڈال دے مجھ کو

یہی ہے معیار آدمیت کہ خودکو اتنا سنبھال رکھنا
جہاں رذالت کے تیر برسیں وہاں شرافت کی ڈھال رکھنا
ہوں لاکھ اسبابِ غیض لیکن تم اپنے معیار سے نہ گرنا
جو رہ میں کانٹوں کی شاخ آئے دعا کے پھولوں کی ڈال رکھنا
گئے دنوں کا حسین منظر، غلام ناقہ پہ شہ زمیں پر
عمل کے میداں میں جب اترنا ،نظر میں ان کی مثال رکھنا

☆

میں نے خودکوحقیر ترسمجھا   اوردنیانے معتبر جانا
پاؤں اپنا سمیٹ کررکھا   اورچادرکو مختصر جانا

☆

لوگ دنیا کی طمع کرتے ہیں
ہم تو اس مال کو دب جانتے ہیں
لوگ بھی کیا ہیں الٰہی توبہ
اب تو پیسے ہی کو رب جانتے ہیں
پتے پتے سے نغمہ سرا کون ہے
اے ہوا تیرے اندر چھپا کون ہے
پھول ،شبنم، شفق،چاندنی کہکشاں
پردۂ حسن سے جھانکتا کون ہے

☆

گنہ سے روکنے والوں کا جب اثر نہ بچا
وبال آیا کچھ ایسا کہ کوئی سر نہ بچا

☆

بھرنے سے بچاؤ کہ گناہوں کی ندی میں
سیلاب جب آئے گا کوئی گھر نہ بچے گا

☆

جو اپنا عیب ٹٹولا تو بس یہی پایا
بہت حقیر تھا لیکن وہ مجھ سے بہتر تھا

☆

ان کا احساس حیا زائل نہ ہونے دیجئے
گھر کی زینت زینتِ محفل نہ ہونے دیجئے

☆

دعا کے ساتھ یہ عزم جواں بھی رکھتا ہے
ہوا کے رخ پہ مگر بادباں بھی رکھتا ہے
سمٹ گیا ہے یہ انساں تو آپ میں گم ہے
نہیں تو بس میں وہ کون و مکاں بھی رکھتا ہے
نشاطِ روح ہے سجدوں میں تیرے سر رکھنا
مرے خدا، مرے اخلاص پر نظر رکھنا

☆

ہزار چاہیں ہدایت تو دے نہیں سکتے
ہمارے بس میں فقط اک دعا ہے اور کیا ہے

☆

تنگ دامن ہے کس قدر دنیا　　　　اپنا دامن پسار کے دیکھو

جناب تپش کی شاعری میں دلکش اشعار کی کمی نہیں۔ انتخاب میں سخت گیری اور احتیاط برتنے کی تمام تر کوششوں کا منہ چڑاتی ان کی غزلیں دامن قرطاس کو تنگ کر دیتی

ہیں۔ یہ وہ تپش ہیں جن کے بارے میں میں نے لکھا ہے کہ چالیس برسوں سے شغل شعرو سخن میں مشغول ہیں اور اب زندگی کے چھٹے دہے میں ہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے والے ہیں فنا پذیری کا منظر گھوم پھر کر آنکھوں سے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ کبھی بستر علالت پر دراز ہو کر اور کبھی احساس کی آنکھوں سے ایسے حالات سے گذرتے ہوئے وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں زندگی کی تمام تر صداقتیں قاری کو یاد آنے لگتی ہیں اور اپنی اپنی ردائے حیات بھی اوچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔

جس طرح میں گذارتا ہوں دن
ایک لمحہ گذار کے دیکھو

☆

زار و نزار ہوں، مگر جاں
برسوں سے اپنی ڈھو رہا ہوں
ہر لمحہ مجھ کو چگ رہا ہے
ہر لمحہ خود کو کھو رہا ہوں

☆

زندگی کا بھروسہ کرنا کیا
پانیوں پر حباب کتنی دیر

☆

مرے وجود کا کتنا عجیب منظر تھا
جگہ جگہ سے میں جیسے پھٹی سی چادر تھا

☆

ظاہر میں تپش کھڑا ہوا ہے
اندر سے مگر وہ ڈھ گیا ہے

اس ڈھتے ہوئے تپش کو اطمینان ہے کہ وہ جیسا بھی رہا جو بھی رہا لیکن بہر حال عام لوگوں سے الگ رہا اور بہتر ہی رہا۔

میں مطمئن تپشؔ ہوں اس پر
جیسا رہا ہوں جو رہا ہوں

اس احساس بہتری کے ساتھ ساتھ اسے یہ شکایت بھی ہے کہ ؎

سب کو دکھلاتا ہے وہ چھوٹا بنا کر مجھ کو
مجھ کو وہ میرے برابر نہیں ہونے دیتا

یہاں میں بھی جناب تپشؔ کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج کا زمانہ نشر واشاعت کی سہولت کا زمانہ ہے تو ساتھ ہی ساتھ زبردست گروہ بندی اور لام بندی کا زمانہ بھی ہے۔ ادبی محاذ وں پر کی جانے والی لام بندیاں نہ جانے کتنے بے گناہوں کا قلعہ قمع کر دیتی ہیں میری یہ کوشش اسی گھیرا بندی اور گروہ بندی کی فصیل میں سینندھ مارنے کی ہے۔ تپشؔ کا یہ عویٰ کہ جس راہ پر وہ چلے ہیں اس پر ان کے بعد ایک بڑا فاصلہ ہے۔ یعنی ان کی راہ پر چلنا آسان نہیں ہے۔ یہ آسان کیوں نہیں؟ تپشؔ خود ہی بتاتے ہیں ؎

یارو تمہیں بتاؤ کہ جس راہ میں چلا
کیا میرے بعد ایک بڑا فاصلہ نہ تھا

☆

میری ہر ایک رات تو دن ہو گئی تپشؔ
ایسا عذاب فن تو کسی کو خدا نہ دے

لیکن اس احساس کے باوجود وہ خدا سے یہ دعا بھی کرتے ہیں ؎

ہر ایک دل میں یہی پیچ و تاب رکھ دینا
مرے خدا مرے فن کا عذاب رکھ دینا

شاعر کی یہ دعا قبولیت کی منزل کو کب چھوئے گی یہ کہنا ذرا مشکل ہے لیکن یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ دعا ایک نہ ایک دن ضرور قبول ہو گی۔

اب تک جو کچھ قلمبند کیا جا رہا تھا وہ سب تپشؔ کی شاعری کی افہام و تفہیم کی کوشش

تھی۔ایک نقاد کا یہی تو کام ہے کہ وہ تخلیق کار اور قاری کے درمیان حائل دیوار کو گرا دے اور اس کے ذہن کو تخلیق کی تفہیم کے لئے آمادہ کر دے۔

مجھے توقع ہے کہ میری اس کوشش سے تپش کی شاعری کی تفہیم کی راہ آسان ہو جائے گی۔اس لئے کہ ادیب اور شاعر جو کرتا ہے۔وہ عام سطح سے بہت بلند چیز ہوتی ہے وہ ایسا کام کرتا ہے جیسا کرنے کا شوق تو انگنت دلوں میں کروٹیں لیتا ہے لیکن اس کو کر گذرنا آسان نہیں ہوتا۔اس کی عظمت کو ذہن نشین کرنے کے لئے ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ اقتباس لائق مطالعہ ہے کہ یہی میری آج کی کوشش کا تمت بالخیر ہے:

> ''ادب کے سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ وہ کائنات کو ورق ورق کرنے کے بجائے اس کی جز بندی کرتا ہے مگر جز بندی فلسفے کی طرح عقلی سطح پر نہیں بلکہ احساس کی سطح پر ہوتی ہے۔وہ یوں کہ ادیب بے جان چیزوں کو ذی روح قرار دینے کی جہت کے تحت باہر کے مظاہر تک روح پھونک کر انہیں زندہ کر دیتا ہے چنانچہ پتھر بولنے لگتے ہیں، چاند مسکراتا ہے، صحرا اسے اپنی جانب بلاتے ہیں حتیٰ کہ کھڑکیاں، منڈیریں اور سڑکیں بھی ذی روح بن کر اس سے مکالمہ کرنے لگتی ہیں۔اشیاء کو روح تفویض کرنے کا یہ عمل جانداروں کو بھی انسانی سطح پر کھینچ لیتا ہے۔چنانچہ درخت آہیں بھرتے ہیں، کلیاں مسکراتی ہیں اور پرندے انسانی محسوسات کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ سناٹا بولتا ہے۔ہوا کا دامن اسے مس کرتا اور سمندر لہریں دیتا ہے۔گویا ادب اپنے لمس سے لخت لخت اشیاء کو باہم مربوط کر کے کائنات کو اس کی یکتائی لوٹا دیتا ہے اور یہ بات عقل کے تجزیاتی عمل کا الٹ ہے۔''

اور تپش کے یہاں یہ سب کچھ موجود ہے۔

☆ (دوسرا مجموعہ کلام ''متاع آئندہ'' کا پیش لفظ)

ملا حسن ناشاد
کی مٹھی بھر غزلیں

موجودہ ضلع بیگوسرائے کے حدود اربعہ میں واقع اس کے شمال مشرق میں بڑی بلیا، قصبہ، حسینا، چھوٹی بلیا، بلیا بازار، میردہ ٹولی، لکھمنیاں، محمود گنج، احمد گنج، بہاالدین سانہہ، پنچویر، صاحب پور کمال، کٹھری اور سعد پور مواضعات مسلم آبادی کا گلدستہ (A bunch of Muslim villages) ہیں۔ تقریباً یہ سبھی مواضعات ایک دوسرے سے نسلی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی حیثیتوں سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔

مسلم عہد حکومت میں بلیا انتظامی نقطہ نظر سے شمالی بہار کا ایک اہم مرکز تھا۔ شہنشاہ اکبر نے پورے صوبۂ بہار کو چھ سرکاروں میں تقسیم کیا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی تعداد کو بڑھا کر سات کر دیا تھا۔ بلیا اولین چھ سرکاروں میں سے ایک، مونگیر کا اہم پرگنہ تھا۔ اسی سے متصل جنوب کی جانب مسجد پور پرگنہ تھا۔ جس کی کئی اہم آبادیاں گنگ شکست کا شکار ہو کر ناپید ہو گئیں۔ بعض آبادی دوسرے مقام پر منتقل ہو گئی۔ جیسے حسینا اور قصبہ وغیرہ۔ حوالہ کے لئے آئین اکبری میں شائع شدہ نقشہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

بلیا مسلمانوں کے بعد انگریزوں کے عہد حکومت تک اہمیت کا حامل رہا۔ بیگوسرائے کے مغربی خطہ کا مرکزی مقام تیگھڑا تھا اس کی حیثیت بھی پرگنہ کی تھی۔ واضح رہے کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں بیگوسرائے کی حیثیت محض بیگو میاں کی سرائے کی تھی (بحوالہ تاریخ بیگوسرائے۔ ڈاکٹر اکھیلشو رکمار) انتظامی نقطۂ نظر سے اس پورے شمالی خطہ میں صرف بلیا اور تیگھڑا کی حیثیت نمایاں تھی۔ ۱۸۷۳ء میں انگریزوں نے بیگوسرائے کو سب ڈویژن کا درجہ عطا کیا۔ اس سے پہلے بلیا ہی کو سب ڈویژن کی حیثیت حاصل تھی جسے

بعد میں Ballia subdvision with headquater of Begusarai بنایا گیا۔ چنانچہ جب بلیا کے نام کے لفظ سب ڈویژن کو خارج کر کے بیگوسرائے کے ساتھ جوڑا گیا تب بھی بیگوسرائے کے سبھی سب ڈویژنل دفاتر بلیا پرگنہ کے حدود میں تعمیر کئے گئے۔ جو آج تک اسی جگہ موجود ہیں۔ یہ حقیقت سند کا درجہ رکھتی ہے۔

بلیا کی حیثیت انتظامی مرکز کی تھی۔ جس کی علامت بڑی بلیا میں چھپنی (چھاؤنی) چھوٹی بلیا، لکھمنیاں اور سانہہ کے آٹھ کیلومیٹر مغرب و مشرق کی لمبائی کے درمیان شمال کی جانب ''چھوٹی ڈیہہ اور بڑی ڈیہہ'' کی موجودگی اور لکھمنیاں کے قریب جنوب میں ''ڈیہہ'' کا ہونا ہے۔ موجودہ بیگوسرائے سے اٹھارہ کیلومیٹر مغرب میں واقع پرگنہ تیگھڑا کی حیثیت ضلعی سطح کی عدلیہ کی تھی۔ تیگھڑا کا قاضیانہ سب سے بڑا تھا۔ اس کے علاوہ قاضی رسول پور، عماد پور، نئے پور اور بیگم سرائے میں قاضیانے قائم تھے۔ لکھمنیاں کے جنوب میں ایک بڑا قاضیانہ ''مسجد پور'' میں واقع تھا۔ (مذکورہ نقشہ میں اسے بھی دیکھا جا سکتا ہے)

بیگوسرائے سب ڈویژن کی تشکیل کے بعد بلیا کو پچھم کی جانب اور تیگھڑا کو پورب کی جانب کھینچ کر یکجا کر دیا گیا۔ بیگوسرائے کے مشہور زمانہ وکیل نعیم الحق صاحب مرحوم نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ ''ان کے ابتدائی ایام وکالت تک سب جج کے چپراسی کے بدن پر جو پٹکا لگا رہتا تھا اس کے چپڑاپر ''سب جج تیگھڑا'' لکھا رہتا تھا۔

جب تیگھڑا کی عدالتوں کو بیگوسرائے منتقل کیا گیا تو اس کی تمام عدالتیں بلیا پرگنہ کے حدود میں ہی قائم کی گئیں۔ ان تاریخی حقائق کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ جس شاعر کا تعارف یہاں مقصود ہے اس کے خاندان کی قدامت اور عظمت، مبرہن کی جا سکے۔ موضع بڑی بلیا میں موجود قدیم مسجد منہدم شدہ نشانات اس کا پیش امام اور محراب۔ اس کے مغرب کی دیوار اور محراب کے گرد پیش کی دیواروں کی نقاشی۔ وہاں کے مزارات اور خانقاہوں سے وابستہ خاندان کا شجرۂ نسب اور شجرۂ سلاسل اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ اس سرزمین پر

مسلمانوں کی پہلی بستی علاء الدین خلجی کے زمانے میں معرض وجود میں آئی۔ مذکورہ مسجد علاء الدین خلجی کے ذریعہ بنوائی گئی تھی۔ بڑی بلیا میں تقریباً سات سو برس پہلے، حضرت علاء الدین بخاری شطاریؔ کا قدوم میمنت لزوم وارد ہوا۔ آج تک ان کا خانوادہ وہاں موجود ہے۔ اس وقت ان کی پندرہویں پشت میں جناب شاہ محمد فیروز بخاری شطاریؔ جلوہ افروز ہیں اور صاحب سجادہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ بڑی بلیا میں خانقاہ شطاریہ کی کچھ باقیات اور سلسلۂ مزارات اس سرزمین کی عظمت پارینہ کی شہادت پیش کر رہے ہیں۔ سالانہ عرس کا سلسلہ جاری ہے۔

بڑی بلیا سے ڈھائی کیلومیٹر مشرق میں جو بلیا واقع ہے وہ کئی حصوں میں منقسم ہے۔ خاص کر بلیا بازار جو مارکیٹنگ ایریا ہے ایک قدیم بازار ہے اس کا Hinter Land بہت بڑا ہے۔ بلیا بازار سے متصل چھوٹی بلیا ہے جو اس کے شمال میں ہے۔ چھوٹی بلیا کے شمال مغرب میں اوپر بلیا ہے۔ جہاں کئی اہم خانوادے عہد عتیق سے فروکش ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق اوپر بلیا کو بلیا بزرگ بھی کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہاں حضرت علاء الدین بخاری شطاری سے پہلے شاہ مظفر صاحب قیام پذیر تھے۔ پشتہا پشت کے بعد جن کی باقیات میں شاہ سلیم صاحب مرحوم کے برادر عزیز شاہ محمود صاحب مرحوم کے ورثاء ہیں شاہ حسن صاحب اور شاہ حسین صاحب مرحومین کے ورثاء شاہ محمد منور برادران اور شاہ محمد مشتاق بردران کا تعلق بھی اسی خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ ان سے متصل مولوی عبدالرشید، سید بابو اور موتی بابو کی اولادیں آباد ہیں۔ ان سے متصل جنوب میں عبدالغفار صاحب مرحوم کی دوسری اور تیسری پشت کی جلوہ سامانیاں بکھری پڑی ہیں۔ اس سے متصل میر خداداد ابن میر سراج الدین ابن میر امام الدین کا پرانا گھرانہ کئی پشتوں سے آباد ہے۔ شاہ سلیم صاحب مرحوم کی رہائش کے مشرق میں شاہ مظفر صاحب کا مزار اور وہاں کی قدیم ترین مسجد ہے۔ اس مسجد سے مشرق متصلاً حاجی حکیم حافظ عبدالنظر صاحب مرحوم اور حکیم عبدالغفار صاحب مرحوم، ان کے برادران اور ان کے جانشین (قاضی) عبدالعظیم حیدری

صاحب اور عبدالحنان صاحب وغیرہ کئی پشتوں سے آباد چلے آرہے ہیں۔اسی طرح اس آبادی میں کچھ خان صاحبان بھی ہیں اور لکھمنیاں سے منتقل ہو کر بودوباش اختیار کرنے والے چودھری صاحبان بھی ہیں۔اس کنبہ کے روشن چراغ پرنسپل چودھری محمود عالم صاحب ڈاکٹر شمیم شہرہ آفاق اور ڈاکٹر محمد نہال صاحب اپنے اسلاف کی یادگار کے بطور موجود ہیں۔ ان سے پورب کی متصل آبادی میر دہ ٹولی ہے جہاں کے جیالوں کا نام گردونواح میں ان کی جاں بازیوں کی وجہ سے مشہور ہے۔آزاد ہندوستان میں وہاں کے باشندگان علوم جدیدہ کے میدان میں اقدامی قوم کی حیثیت سے آگے بڑھ رہے ہیں۔الحمدللہ اب وہاں ڈاکٹر، انجنیئر ،ایڈمنسٹریٹر،ٹیکنو کریٹ اور سیاس سب دستیاب ہیں۔

ان آبادیوں سے نکل کر پورب کی جانب لکھمنیاں واقع ہے جو تقریباً ڈیڑھ مربع کیلومیٹر کو محیط ہے۔یہ آبادی اپنی علمی اور ادبی فضیلتوں کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ پورے ضلع میں ادب واحترام سے دیکھی جاتی ہے بلکہ بلاشبہ اس کی شہرت اور مقبولیت پورے برصغیر کے اطراف واکناف میں دیکھی،سنی اور محسوس کی جاتی ہے۔

لکھمنیاں بڑی بلیا سے تقریباً تین سو سال بعد آباد ہوا۔حضرت علاء الدین بخاری شطاریؔ کا ورود مسعود بڑی بلیا میں ۹۰۰ءمطابق ۱۴۹۳ھ بہ عمر ۴۲ رسال ہوا۔ان کا انتقال ۹۳۳ھ مطابق ۲۶ رمارچ ۱۵۶۲ کو ہوا۔ان کی ساتویں پشت میں حضرت مسیح الدین حسن بخاری شتاریؔ رحمتہ اللہ علیہ کی پیدائش ۱۱۱۲ھ مطابق ۱۷۰۰ء میں ہوئی اور ان کا انتقال ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۷۹ء میں ہوا۔آپ صوبۂ بہار کے قدیم ترین شاعروں میں سے ایک تھے۔شاہ مسیح الدین حسن بخاری کے آس پاس کے دنوں میں لکھمنیاں میں حضرت شیخ سلطان صاحب نقش بندی، مجددیؒ کا زمانہ تھا۔لکھمنیاں کی آبادی کا سر آغاز حضرت شیخ سلطان صاحبؒ سے مانا جاتا ہے۔حضرت سلطانؒ صاحب کی سوانح حیات کی تفصیلات اب تک پردۂ خفا میں ہیں۔البتہ ان کے ایک عقیدت مند جناب گھنشیام عبداللہ کا پتہ ملتا ہے۔ جن کا انتقال ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۷۲۷ء میں ہوا۔حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفۂ ارشد حضرت

آدم بنوریؒ کے اخلاف میں کئی نام ''نزہت الخواطر'' (مرتبہ مولانا عبدالحیٔ) میں درج ہیں ان میں حضرت شیخ سلطان بلیاوی نوراللہ مرقدہٗ کا ذکر نہیں ہے۔ انتہائی افسوس کا مقام یہ ہے کہ اپنے زمانہ کے جلیل القدر شیخ وقت کی سوانح حیات ہنوز تشنۂ ترتیب ہے۔

حضرت شیخ کی عظمت اوران کے قدوم بابرکات کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرورایام نے کیسے کیسوں کوایسا ویسا بنادیا لیکن یہ ایک آبادی ہے کہ جس کی ترقی کا سفر تقریباً تین سو سال قبل جوشروع ہوا تھا وہ الحمدللہ ہنوز جاری ہے۔ آپ کے سلسلۂ مجددیہ نے یہاں کے باشندوں کے اندر عزم وحوصلہ کے ساتھ ساتھ اولوالعزمی کا ملکہ بھی پیدا کردیا۔ علوم وفنون سے رغبت خصوصاً شعروادب سے گہرا تعلق اس آبادی کا خاصّہ ہے۔

جیسا کہ قبل ذکر کیا جاچکا ہے کہ تاریخ بہار کے مصنف ڈاکٹر رادھا کرشن چودھری اور تاریخ بیگوسرائے کے مرتب ڈاکٹر اکھلیشور کمار کے مطابق ضلع بیگوسرائے کے حدود اربعہ میں کئی آبادیاں ایسی تھیں جہاں قاضیانہ قائم تھا۔ ان مقامات میں سب سے بڑا قاضیانہ دانیال پور تیگھڑا میں تھا۔ پھر اسی علاقہ میں قاضی رسول پور جہاں کی گڑھی کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ نیئے پور، عماد پور اور ٹھوکری چک کا ذکر ملتا ہے یہ سب پرگنہ تیگھڑا میں واقع تھا۔ پرگنہ بلیا میں صرف ایک قاضیانہ کی خبر ملتی ہے جو موضع ''مسجد پور'' میں قائم تھا۔ مسجد پور مسلمانوں کی ایک بڑی اور صاحب فضیلت آبادی تھی۔ اس کے پڑوس قصبہ اور حسینہ آباد تھا۔ (موجود قصبہ دیارہ اور حسینہ موجود حسینا دیارہ)۔

یہ سبھی آبادیاں ساحل گنگا پر آباد تھیں۔ گنگا ندی نے جب اپنے شمالی ساحل کو کاٹنا شروع کیا تب ان تمام آبادیوں کے لوگ پناہ لینے کے لئے وہاں سے نکل پڑے۔ سب سے پہلے مسجد پور والوں نے دانشمندانہ قدم اٹھایا۔ اس کے تقریباً تمام لوگ وہاں سے نکل کر سیدھا ''سلطان پور چک مکن عرف لکھمنیاں'' آکر آباد ہو گئے اور کچھ لوگ شہر مونگیر کے محلّہ رائے سر میں جابسے۔ حضرت شیخ سلطان جو خود سادات میں سے تھے ان کی اولادیں شاہ صاحبان کے نام سے لکھمنیاں میں آباد تھیں ان کے علاوہ اور بھی کچھ دیگر برادریوں کے

خاندان آباد ہو چکے تھے جن میں سب سے اہم خاندان وہ تھا جو حضرت شیخ کے عقیدتمندوں اور حلقہ بگوشوں کا تھا اور ایک انصاری خاندان بھی تھا۔ حضرت شیخ نے اس خاندان کے حوالہ مسجد کی خدمت کر رکھی تھی اور انہیں بطور جاگیر بیس بیگھہ جائیداد دے دی تھی۔ وہ خاندان نسلاً بعد نسل آج بھی اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہے۔

مسجد پور سے جو لوگ منتقل ہو کر لکھمنیاں آئے تھے ان میں سب سے اہم اور بڑا گھرانہ قاضی صاحبان کا تھا جو موجودہ لکھمنیاں کے مشرقی حصہ میں فروکش ہوا۔ اس جگہ پر انہوں نے بارہ بیگھہ کا ایک طویلہ تعمیر کرایا تھا جس کے پچھمی کنارہ پر ان کی رہائش تھی اور پوربی کنارہ پر ایک پائیں باغ جو ''لیچی باڑہ'' کے نام سے مشہور تھا۔ روایت کے مطابق قاضی صاحبان اپنے اس باغ میں لیچی کے زمانہ میں پیڑ میں پانی کے بجائے دودھ سے اس کی سیرابی کرتے جس کی وجہ سے اس کی لیچی سرخ ہونے کی بجائے سبز رہا کرتی اور رس سے بھری ہوتی تھی۔ وہ لیچی ان کے متعلقین، روساء اور امراء کے علاوہ پوری آبادی میں تقسیم کرائی جاتی تھی۔ آج بھی اس طویلہ کی مغربی دیوار کا تھوڑا حصہ محفوظ ہے جو پتلی اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ قاضی صاحبان اس زمانہ میں سب سے زیادہ معزز اور متمول لوگ تھے۔ انہیں قاضیوں سے بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر وابستہ مفتی اور ملا صاحبان بھی تھے۔ ان کے علاوہ سادات، شیوخ اور چودھری صاحبان بھی انتقال مکانی کے بعد لکھمنیاں آکر آباد ہوئے تھے۔ قاضی صاحبان کی زمینداری شہر مونگیر سے باہر جنوبی خطہ میں سینکڑوں کیلومیٹر میں واقع تھی۔ جس کا آخری حصہ ''اختتام زمینداری'' کے بعد ان کے ورثاء نے حکومت ہند کے حوالہ کیا ہے۔ قاضی صاحبان کے بعد دوسرا زمیندار گھرانہ چودھری صاحبان کا تھا جنہیں لکھمنیاں پٹی کے کچھ علاقہ کے علاوہ پوری سعد پر پٹی جس میں کئی مواضعات تھے کی زمینداری ملی ہوئی تھی۔

مسجد پور سے مختلف خاندانوں نے لکھمنیاں میں آباد ہو کر لکھمنیاں کو ایک قوس و قزح کا پیکر عطا کر دیا تھا۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں جو لوگ

تعلیم وتعلم کے منصب پر فائز ہوتے، انہیں ملاّ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ ملاّ جیون ہوں یا ملاّ علی قاری۔ یہ ملاّ حضرات امراء ورؤساء کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور معمولی سے قوت لایموت کو اکل حلال سمجھ کر قبول کرتے تھے البتہ اپنے بچوں کو بھی زیور علم سے آراستہ رکھا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم عہد حکومت کے بعد انگریزوں کے دور میں بھی ملاؤں کو دفاتر اور عدالتوں میں مناصب ملتے رہے۔ اس عہد میں سب سے بڑی سند علمی۔ ''عالم اور منشی'' تھی۔ منشی غیر مسلم حضرات بھی ہوا کرتے تھے لیکن عالم صرف مسلمان ہوتے تھے۔ لکھمنیاں کی سطح پر ملاّ حضرات بعد کے دنوں میں منشی کے عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ملاّ حضرات نسل درنسل صحیفہ علم ہاتھوں میں لے کر ہمیشہ قاسم العلوم بن کر رہے۔

لکھمنیاں پہونچ کر ان ملاؤں نے لکھمنیاں کو ''دیار علم'' (Educational area) میں تبدیل کر دیا۔ قاضی اور مفتی صاحبان دوش بدوش ان کے ساتھ رہے۔ چودھری عبدالطیف، چودھری محمد یعقوب اور چودھری محمد اسماعیل صاحب جیسی شخصیات نے اس چراغ علم کو رنگ و روغن بخشا اور اس کی لو تیز کر دی۔ ان حضرات کی خدمات الگ سے موضوع مطالعہ بننے کے قابل ہیں۔ اس لئے کہ لکھمنیاں اور اس کے گردونواح میں آج علم کا جو چراغ روشن ہے وہ سب انہیں حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آج کی نئی نسل کو اس سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ ''مسجد پور'' کے دریابرد ہونے اور اس کی آبادی کی منتقلی کے بعد موضع قصبہ اور موضع حسینا بھی ساحل گنگا سے اٹھ کر لکھمنیاں کے شمال مغرب میں آکر آباد ہو گیا۔ انگریزوں کے زمانہ میں جب برونی کٹیہار ریلوے لائن بچھائی گئی تو لکھمنیاں کے نام کا اسٹیشن قائم ہو گیا جو آج بھی لکھمنیاں کی عظمت کے گیت گا رہا ہے۔

جس ملاّ خاندان کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا گیا ہے اسی صاحب عظمت ملاّ خاندان کے چشم و چراغ ملاّ محمد احسن عرف چھیتو اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے لکھمنیاں سے پانچ کیلومیٹر شمال مشرق کی آبادی موضع ''سعد پور'' جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے میں جا کر قیام پذیر ہو گئے۔ لکھمنیاں کے چودھری صاحبان کی زمینداری میں کچھ حصہ ان کا بھی

تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ان کی زمینداری کی نگہداشت بھی کیا کرتے تھے۔ ملا جی کو پروردگار نے پانچ بیٹوں سے نوازا۔ ان کے بڑے صاحبزادہ ملا محمد محسن مرحوم۔ کے دوسرے فرزند ملا محمد حیدر، صاحب کلیات شاعر ہیں وہ اس وقت ریٹائرمنٹ کی زندگی رانچی میں اپنے بڑے صاحبزادہ کے ساتھ گذار رہے ہیں۔ ملا چھیتو صاحب کے چوتھے صاحب زادہ ملا محمد حسن ناشاد مرحوم ہیں۔

ملا محمد حسن کی پیدائش ۱۹۲۸ء میں موضع سعد پور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم کے علاوہ گھر کے دوسرے بزرگوں سے حاصل کرنے کے بعد آپ لکھمنیاں بلیا منتقل ہو گئے۔ لکھمنیاں میں اس زمانہ میں چودھری عبداللطیف اور چودھری محمد یعقوب صاحبان کی تدریسی خدمات کا شہرہ تھا۔ ان حضرات نے مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا بیڑہ اٹھا رکھا تھا۔ بلا تفریق نسل ونسب ہر کسی کے لئے ان کا آستانہ علم کھلا رہتا تھا۔ جس بچہ کے والدین معاشی طور پر کمزور ہوتے انہیں یہ لوگ سارا خرچ برداشت کر کے کلکتہ یونیورسٹی اور بعدہٗ پٹنہ یونیورسٹی سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کرایا کرتے تھے۔ ان کے تیل نمک کا سارا انتظام وہ لوگ خود کیا کرتے۔ لطیفہ کے بطور ایک پر لطف بات یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس زمانہ میں کہ جب ماسٹر عبداللطیف اور ماسٹر محمد یعقوب صاحبان مسلمان بچوں کو انگریزی تعلیم سے جوڑ کر لکھمنیاں کے سرسید کا مرتبہ پا رہے تھے تو عین انھیں دنوں میں لکھمنیاں میں اکبرالہٰ آبادی کے چیلے پیدا ہو گئے۔ جنھوں نے انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کی اور یہ فتویٰ جاری کر دیا کہ جو ''انگریزی پڑھے گا مرنے کے وقت اس کا منہ سور کے جیسا ہو جائے گا۔'' (معاذ اللہ) لطف کی بات یہ بھی ہے کہ جہاں سے یہ بات پھوٹی تھی وہیں کے لڑکے باہر رہ کر انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور یہاں کے عوام اس فتویٰ کا تعویذ گلے میں لٹکائے پھر رہے تھے۔ لیکن لکھمنیاں کے سرسید بھی ہمت کا پہاڑ بن کر ڈٹے رہے۔

ملا حسن ناشاد مرحوم نے ایس اے ایس ہائی اسکول بلیا سے ان نامساعد حالات میں ۱۹۴۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ امتحان پاس کرتے ہی انہیں

مونگیر کلکٹریٹ میں ملازمت مل گئی۔ مونگیر سے مختلف دفاتر میں ان کا تبادلہ ہوتا رہا۔ وہ ہمیشہ سکون، انہماک اور استقلال سے اپنی روزی حلال کرنے کی فکر میں کوشاں رہے۔ وہ ایک سادگی پسند، سنجیدہ طبع اور ایماندار شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں جہاں ٹرانسفر کر دیا جاتا وہ بخوشی وہاں چلے جاتے۔ تنخواہ کے علاوہ کبھی انہوں نے دائیں بائیں نہیں دیکھا۔ اطلاع کے مطابق ان کے جیبوں کی جانب کبھی کسی کا پوشیدہ ہاتھ نہیں بڑھا۔ خوش نصیبی سے ان کی اہلیہ بھی خاکسار، منکسر، سعادت منداور توکل پسند تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر پر کبھی بیجا دباؤ نہیں بنایا۔ وہ خود ایک صاحب مال گھرانہ کی پروردہ تھیں۔ لیکن شادی کے بعد کبھی انہوں نے اپنے مائیکہ کی طرف لالچ بھری نگاہ سے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے زمانہ کے عام لوگوں نے ان کے بچوں کو بھی سادہ اور منکسر دیکھا۔ ملا صاحب نے بیٹوں کی تعلیم پر پوری توجہ صرف کی لیکن کبھی کسی پر کوئی دباؤ نہیں بنایا جس بیٹے نے اپنے لئے جس راہ کا انتخاب کر لیا اسے اسی راہ پر چلتا ہوا انہوں نے چھوڑ دیا۔ پروردگار نے انہیں بھی پانچ بیٹوں سے نوازہ بڑے لڑکے نے سائنس میں ایم ایس سی کر کے لائف سائنس کا معلم بن جانا قبول کر لیا۔ ہندی اردو میں شاعری بھی کی اور اچھے افسانے بھی لکھے۔ ڈاکٹر شبیر حسن کے نام سے معروف ہوئے اشتراکی تحریک سے وابستہ ہو کر "سروہارہ وَرگ" کی خدمت کے لئے خود کو وقف کر لیا۔ خیر سے اب وہ اسلامی نظریۂ حیات کی طرف بھی جھانک تاک کرنے لگے ہیں۔ ان کے دوسرے نور نظر نے سیاست کے میدان میں زمانۂ طالب علمی ہی میں قدم رکھ دیا۔ سوشلزم کی تحریک کو گلے لگایا۔ رام منوہر لوہیا کے نظریات کا مطالعہ کیا، کرپوری ٹھاکر کی شاگردی اختیار کی اور جے پرکاش کی "تحریک مکمل انقلاب" کے ہمنوا ہو گئے۔ آرٹس کی تعلیم حاصل کر کے پی ایچ ڈی تک کی سند حاصل کر لی۔ ان کے مکتب کے فارغ سینکڑوں نہیں ہزاروں طلبا پورے بہار میں دلتوں اور کمزوروں کی خدمت میں مصروف ہیں اور ان کے حقوق انہیں دلانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ تنویر حسن ابھی چوتھی بار بہار اسمبلی کے ایوان بالا کے رکن کی ذمہ داری نباہ رہے ہیں۔ جبکہ ان کے برادر بزرگ ڈاکٹر شبیر حسن آر ڈی

اینڈ ڈی جے کالج مونگیر میں صدر شعبہ علم نباتات کے عہد پر فائز ہیں۔ ناشآد صاحب کے تیسرے فرزند آفتابؔ حسن نے اپنے برادرِ دوئم کی راہ اختیار کر لی۔ چوتھے بیٹا ماہتابؔ حسن نے بھی اپنا نسبی پیشہ معلمی اختیار کر لیا ہے وہ بھی ایم اے اور پی ایچ ڈی کے سند یافتہ ہیں۔ پانچویں ملاّ تاجؔ حسن نے خود آئی پی ایس کیا اور دوسری آئی پی ایس نزہتؔ حسن کو شریک زیست بنا کر ۔

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

میں نظم ونسق کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ فی الوقت دونوں کے دونوں ڈی آئی جی کے منصب پر فائز ہیں۔ (اس وقت تاج حسن دلی میں ڈی آئی جی سیکیوریٹی کے انچارج ہیں)۔

یہ تفصیلات اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ اگر کوئی آدمی متوکل اور مستغنی ہو کر اپنی زندگی گذارنا چاہے تو رازق العباد اسے دنیا میں اتنا نوازتا ہے کہ وہ عالم رنگ و بود میں ایک روشن مثال بن جاتا ہے۔ رہی بات ابدالاباد کی کامیابیوں کی تو یہ پروردگار عالم نے انسانوں کے لئے خالص اختیاری چیز بنا دی ہے۔ جو چاہے اسے حاصل کر لے۔ جو چاہے اس سے منہ موڑ لے۔ اختیار کرنے والا فقد فاز فوزاً عظیما سے سرفراز ہوگا۔ اور اس کا چھوڑنے والا عذاب الیم کا مستحق ہوگا۔ مرزا غالبؔ نے بطور افتخار لکھا ہے ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالبؔ کے اسی شعر میں ہلکی سی تحریف کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ملاّ حسن ناشآد نے ''سپہ گری'' کے بجائے ''پیشۂ آباء معلمی'' کو لائق افتخار سمجھا۔ اپنے بیٹوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ کماحقہٗ کامیاب بھی ہوئے۔ دونوں میاں بیوی آزمائشوں میں اپنی زندگی گذار کر جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے ایک شاداب باغ چھوڑ گئے۔

جہاں تک جناب ناشاد کی شاعری کی بات ہے۔ میری معلومات کی حد تک اس کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ یہ حادثہ لکھمنیاں کے بیشتر شعراء کے ساتھ ہوا اور شاید ہوتا بھی رہے گا۔ اس کی وجہ ان کا حد سے زیادہ انکسار اور خود ناشناسی ہے۔ جب تک یہاں کے لوگوں میں حوصلہ رہتا ہے اس وقت تک وہ جوش اور ولولہ کی نمائش کرتے ہیں۔ لکھمنیاں کا جو شعری ماحول رہا اس سے تحریک پا کر گرد نواح کے تخلیقی فنکاروں نے بھی اپنے اوصاف و کمالات کی بھرپور نمائش کی۔ لیکن جیسے ہی فکر دنیا میں سر کھپانے کا آغاز ہوا تمام کاوشیں خود فنکاروں کی نظر میں نا قابل التفات بن گئیں۔ ملا محمد یحییٰ شیدا، ملا علی الزماں علی، فیاض احمد شوخ اور بدر الزماں اشک کا معاملہ یہی رہا بدر الاسلام بدر، شاہ عزیز الرحمٰن عزیز، شاہ افضال الرحمٰن بسمل، ضیا الرحمٰن ناشاد، معین الدین درد اور ریاض بلیاوی اپنا اپنا مرتب مجموعہ کلام اپنے پیچھے چھوڑ گئے لیکن ؎

کسی نے حال نہ پوچھا دل شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا؟

حالیہ دنوں میں قاضی زبیر بیخود جیسے استاد وقت، ماہر غزل گو اور ایک قادر الکلام شاعر نے اس دنیا سے منہ موڑا اور ان کا ''کلام بیخود'' Pilar to post کا مصداق بنا ہوا ہے۔ لے دے کے ایک شاہ اسرار الرحمٰن آتش خوش نصیب ٹھہرے کہ راقم الحروف کی نگرانی میں ایک تحقیقی مقالہ ایل این ایم یو میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنے کے لئے جمع کر دیا گیا اور عزیزہ نگہت پروین اس کے فیض سے پی ایچ ڈی کی سند سے سرفراز ہو گئیں۔

یہ المیہ اس مرکز شعر و سخن کی پیشانی کا داغ ہے جسے مٹانے کی ایک حوصلہ مندانہ کوشش ملا حسن ناشاد مرحوم کے خوش بخت صاحبزادوں نے کی ہے۔ جناب ناشاد کی اہلیہ کا انتقال ۳۱/ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں ہو گیا۔ ان کی رفاقت میں جناب ناشاد تزک و احتشام کے ساتھ زلف غزل کی آرائش میں مصروف و مشغول تھے۔ ناچیز نے لکھمنیاں کی شعری مجلس میں انہیں غزل سناتا ہوا اور داد پاتا ہوا دیکھا ہے۔ وہ میری کم عمری کے ایام تھے۔ میں اس

وقت محفل کی گرما گرمی کو دیکھ کر خوش ہونے اور لطف اٹھانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ میرے والد محترم اور مرحوم چچا بدرالزماں اشک میری صغرِ سنی کے باوجود مجھ کو ایسی محفلوں میں ضرور لے جایا کرتے تھے۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد ناشاد صاحب مسائل میں کچھ اس طرح الجھے کہ تمام مجلس و محفل سے منہ موڑ کر خانہ نشیں ہو گئے۔ بیٹے سب کے سب زیرِ تعلیم تھے۔ بڑی بیٹی سیانی ہو چکی تھی اس کے ہاتھ پیلے کرنے تھے۔ دوسری بچیاں بھی بڑی بہن کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ملازمت کی ذمہ داریاں سِوا ہو چکی تھیں۔ ایسے حالات میں شاعری کسے سوجھتی؟

۱۹۷۹ء سے جب میں نے ضلع بیگوسرائے کی علمی ادبی تاریخ کی تحقیق اور ترتیب کا کام شروع کیا، تو اس عہد میں موجود تمام اہل علم اشخاص و افراد، شعراء اور ادباء ہی نہیں عام اصحابِ فہم و دانش سے بھی میں نے بستی بستی، قریہ قریہ جا جا کر ملاقات کی تھی۔ اس کوشش نے میرے پاس ضلع بھر کی مسلم آبادی کا بنیادی تاریخی مواد جمع کر دیا۔ اس مرحلہ میں جب ناشاد صاحب سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو حسب معمول خندہ پیشانی سے انہوں نے پرسش حال کیا۔ میں نے جب اپنا مقصد ورود بتایا تو کہنے لگے ''بیٹا'' اب شاعری واعری کہاں؟ اب یہ سب تم لوگ کیا کرو۔ اب تو ہر وقت گھریلو معاملات میں الجھا رہتا ہوں۔ بچیاں سیانی ہو چکی ہیں۔ انہیں سنبھال کر رکھنے والی ذات نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اللہ کی مرضی یہی تھی۔ اب فرصت کہاں کہ شاعری کروں۔'' یہ تھے ان کے حسرت ویاس بھرے الفاظ۔ دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز۔ میرے اصرار پر کہنے لگے۔ ''اب وہ ڈائری وغیرہ کہاں ہے اسے کون بتائے؟ وہ مرحومہ تھیں کہ میرے ایک ایک کاغذ کو سمیٹ سمیٹ کر رکھا کرتی تھیں۔'' جب میں نے زور دیا تو مجھ کو وعدۂ فردا پر انہوں نے ٹال دیا۔ ''اچھا پھر کبھی آؤ''۔

دو تین ماہ بعد میں پھر ان کے پاس گیا۔ مسکرا کر کہنے لگے۔ ''تم چھوڑو گے نہیں۔ میں نے سمجھا تھا رات گئی بات گئی۔'' اس کے بعد اٹھ کر اندر چلے گئے۔ ناشتہ کے ساتھ اچھی سی سادہ چائے آئی لیکن ڈائری نہیں آئی۔ میں بھی جم کر بیٹھ گیا۔ آخرش وہ اپنی ڈائری لے آئے۔ کہنے لگے دیکھو اس میں بہت ساری ایسی تحریریں بھی ہیں جو میرے لئے صیغۂ راز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ان اوراق کو کھول کھول کر دکھایا جس پر ان کی

شاعری درج تھی۔ کچھ کٹی ہوئی کچھ پھٹی ہوئی۔ کچھ اُگی ہوئی کچھ مٹی ہوئی۔ کہنے لگے یہی میرا سرمایۂ شاعری ہے۔ اب کبھی موقع ملے گا تو انہیں صاف کر کے لکھوں گا اور تمہیں دے دوں گا۔'' لیکن فرصت کا وہ دن ان کی حیات میں نہیں آیا۔

ملازمتی زندگی کا جو سفر انہوں نے کلکٹریٹ سے شروع کیا تھا وہ بلیا، کھڑگ پور، بکھری، گوگری اور صاحب پور کمال بلاکوں سے گذرتا ہوا ۳۱ رمئی ۱۹۸۵ء پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔ پھر یہ ہوا کہ ۳۰ رنومبر ۱۹۹۲ء کو داعیِ اجل آیا اور وہ اس کے ساتھ چلے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میری ان کی ملاقات ۱۹۸۲ء میں ہوئی تھی اور اب ۲۰۱۰ء میں ان کے کلام کا کچھ نمونہ میرے سامنے رکھا ہے۔ جس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ بحیثیت غزل گو ملاّ حسن ناشاد ایک کامیاب شاعر تھے۔ حالانکہ ان کا انتقال ابھی سترہ اٹھارہ برس پہلے ہوا ہے۔ کاش انہوں نے خود کو پہچانا ہوتا اور اپنی شاعرانہ صلاحیت کا استعمال کیا ہوتا۔ سادگی اور خود ناشناسی کے اس انداز نے کتنوں کو بے نام و نشان کر دیا۔ ملا حسن ناشاد ایسے لوگوں میں سے ایک تھے۔ ان کی غزلوں کو بیک نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان غزلوں میں غزل کے تمام اوصاف موجود ہیں اور بہ مقدارِ وافر موجود ہیں۔ نفس مضمون ہو یا طرز اظہار دونوں ہی حیثیتوں سے ان کے اشعار لائق اعتنا ہیں ؎

جوانی کیا بلا آئی کہ ہر شئے بے قرار آئی
تڑپ بجلی کی رگ رگ میں ستم گر کی اتار آئی
کچھ ایسی زلف بکھری ہوگئی شام و سحر یکجا
اسیر زلف ہو کر گردشِ لیل و نہار آئی
بھروسہ کس پہ ہو یارب حیا قاتل ادا قاتل
جوانی کی ہر اک انگڑائی ظالم فتنہ کار آئی
نہ شکوہ کر سکا ناشادؔ، ترے طرز تغافل کا
تیری محفل میں میری بے زبانی شب گذار آئی

پہلی غزل کے یہ اشعار بطور نمونہ ہیں۔ تغزل سے لبالب یہ ایک جام غزل ہے۔

ہر شعر محاکاتی انداز لئے ہوئے ہے۔ ترکیب الفاظ، گہر انقش مرتسم کرنے والے ہیں۔ مقطع کا شعر اس کی واضح مثال ہے۔ اب دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ۔

امید وفا ہے نہ اس سے نہ اس سے
حیا قاتلانہ، ادا کافرانہ
تبسم پہ واری، اداؤں پہ قرباں
حیا پر نچھاور، ادائے زمانہ
عقیدت میں تیری، یہ سمجھا ہے میں نے
ہراک نقش پا، کو ترا آستانہ
اسے آپ ناشاد، چھیڑیں نہ ہر گز
ہوئی زلف برہم، تو برہم زمانہ

یہاں بھی وہی حسن وعشق کے قصے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ ہے، وفا اور جفا کا ذکر ہے۔ پہلی غزل میں حیا اور ادا دونوں قاتل تھی ۔ دوسری غزل میں حیا قاتلانہ ہے تو ادا کافرانہ ہے۔ یعنی ایک جاں گسل ہے تو دوسری ایماں شکن۔ شاعر کے سامنے کھائیں کدھر کی چوٹ بچائیں کدھر کی چوٹ والی کشمکش ہے۔ لیکن اس عشق وعاشقی کے ذکر کے ساتھ کچھ اور بات بھی کہی جاتی نظر آرہی ہے۔ جس پر جتنا غور کرتے جایئے بات دور تک جاتی نظر آئیگی ۔

عقیدت میں تیری یہ سمجھا ہے میں نے
ہر اک نقش پا کو ترا آستانہ

اسی کے پہلو بہ پہلو ناشاد کا یہ مقطع بھی ہے ۔

اسے آپ ناشاد چھیڑیں نہ ہر گز
ہوئی زلف برہم تو برہم زمانہ

ناشاد کے مقطع کے اس شعر کو دونوں طرح کے افکار کے درمیان سے گذار کر دیکھئے آپ کو صاف یہ محسوس ہوگا کے یہ دونوں فکر کے کناروں کو چھو کر گذرنے والا سفینۂ تخیل ہے۔ اس طرح یہاں ذو معنین کا لطف حاصل ہوگا۔ ناشاد کے اشعار میں خود ان کی زندگی کا کرب بھی دیدنی ہے ۔

ناممکل ہے ابھی تلخیٔ ایام حیات
دل کے ہر زخم کو ناسور بنالوں اے دوست
کاوشِ غم سے نہ فرصت ہے نہ آرام کبھی
زیست کو گردشِ پیہم سے بچالو اے دوست

☆

حاصل ہے لطف زیست اسی درد سے مجھے
ناشاد اپنے درد کا درماں نہ کیجئے

ناشادؔ تلخیٔ ایام کو ناممکل مان کر اپنے زخم کی پرورش اس وقت تک کرنا چاہتے تھے۔ جب تک کہ تلخیٔ حیات تکمیل نہ پا جائے۔ خواہ اس چکر میں زخم ناسور کی شکل کیوں نہ اختیار کر لے۔ یہ شاعر کی اذیت پسندی نہیں حالات سے پنجہ آزمائی کی جدوجہد اور کوشش اور کاوش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں ۔

ناشادؔ اپنے درد کا درماں نہ کیجئے

شاعر کو اس حقیقت کا عرفان ہے کہ عزم و ہمت، موّاج دریا کو بھی ساحل پر سر پٹکنے کو مجبور کر دیتی ہے ۔

عزم و ہمت کی بلندی کا تماشہ دیکھئے
موج دریا خود جھکا دیتی ہے سر، ساحل کے پاس

میر تقی میرؔ نے عالم یاس میں کہا تھا ۔

ایک محروم پھرے میرؔ ہمیں دنیا سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کچھ

اس کے برخلاف ناشادؔ کہتے ہیں ۔

یوں چلا جائے تمہاری بزم سے ناشادؔ کیوں
کیا غضب کی بات ہے تشنہ لبی ساحل کے پاس

شاعر لب ساحل سے تشنہ واپس جانا نہیں چاہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عشق حاصل حیات ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بڑی شان سے کہتا ہے ۔

عشق میں بے پناہ لذت ہے
عمر گذرے گی آزمانے میں

ناشادؔ نے جتنے دن شاعری کی، زیادہ تر غزل ہی لکھتے رہے۔ گرچہ کچھ قطعات رباعیات اور نظمیں بھی ان کی ڈائری میں میری نظر سے گذری تھیں۔ اب یا تو وہ سب گم ہو گئیں یا پھر انہیں دوسرے وقتوں کے لئے اٹھا رکھا گیا ہوگا۔ بہر حال انہوں نے غزل کو غزل بنائے رکھا۔ یہ ان کی فطرت کا تقاضہ بھی تھا اور اس عہد کے لکھمنیاں کا مزاج بھی تھا۔

ہندوستان کی آزادی کے آس پاس لکھمنیاں، بارو، تیگھڑا اور شہر بیگوسرائے کا جو شعری ماحول تھا اس ماحول میں رنگ و رامش بھرنے والے جناب مبارکؔ عظیم آبادی، مولوی وصیؔ الدین تیگھڑوی، مولوی ارشد علی ساغرؔ باروی، حضرت خلیلؔ بیگوسرائی، حیرتؔ باروی، مولوی محمد سعید مضطرؔ اور محترم حافظ مشکیؔ پوری وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ شہر بیگوسرائے میں ان حضرات نے شعر وسخن کی شمع فروزاں رکھا تھا۔ یہ سب کے سب غزل گو شعراء تھے۔ گرچہ نظم نگاری، رباعی گوئی اور قطعات نویسی میں بھی انہیں درک حاصل تھا لیکن طرحی غزلوں کی نشستوں نے غزل کا بول بالا رکھا تھا۔ پھر جناب خلیلؔ بیگوسرائی کے لئے لکھمنیاں مرید آباد بن گیا تھا۔ لکھمنیاں کے کچھ شعراء ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں سب سے نمایاں نام جناب معینؔ الدین دردؔ کا تھا۔ لکھمنیاں میں شعری نشستیں پابندی سے ہوا کرتی تھیں۔ وقفہ وقفہ سے بڑے مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے جن میں جناب حافظ مشکیؔ پوری بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں مبارکؔ مونگیری جب بھی اپنے گھر موضع حسینہ آیا کرتے تو کم از کم ایک بار مشاعرہ کی محفل ضرور برپا کرتے اور اس محفل میں بھی طرحی غزلیں پڑھی جاتیں پڑھنے والے بیشتر شعراء لکھمنیاں کے ہوتے۔ مبارکؔ مونگیری اور حافظ مشکیؔ پوری پابند نظمیں خوب خوب لکھتے لیکن عوامی طور پر غزل سنا سنا کر داد و تحسین وصول کرتے۔ خلیلؔ بیگوسرائی کو جناب ریاضؔ خیر آبادی کا تلمذ حاصل تھا۔ لیکن فکر وفن میں وہ نوحؔ ناروی، جلیلؔ مانک پوری اور جگرؔ مراد آبادی پر نگاہ رکھتے تھے۔ خلیلؔ بیگوسرائی کی غزل گوئی کا بالواسطہ اثر لکھمنیاں کے شعری ماحول پر پڑا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اسی زمانہ میں اردو شاعری کی زلفیں سنوارنے والے اور بھی دو

شعراء تھے جو بالکل خاموشی سے تخلیق ادب میں مشغول تھے۔ یہ تھے ملا محمد یحییٰ شیدآ جو غزل میں زندہ تخلص کرتے تھے اور اس کی خبر کسی کو نہ تھی۔ دوسرے زبردست قادرالکلام شاعر نصیر الدین فریآد باروی تھے جو جناب شیدا کے پیر بھائی تھے اور رازداں بھی تھے۔

کہیں سے یہ بات نہیں معلوم ہوسکی کہ جناب ملاّ حسن ناشآد نے خلیلؔ بیگوسرائی یا اور کسی کی شاگردی قبول کی ہو۔ لیکن جس ماحول کا ذکر کیا گیا اس کا نمایاں اثر جناب ناشآد کی شاعری پر نظر آتا ہے۔ البتہ وہ غزل میں صرف تذکرہ گل و بلبل تک محدود نہیں رہے۔ بلکہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کو انہوں نے موضوعِ سخن بنایا۔ بطور مثال مزید چند اشعار کی پیش پر گفتگو تمام کرتا ہوں۔

نہیں جل سکی تھی جو شمع کبھی
وہ طوفاں کی زد میں جلا کر چلے
کشش تھی یہ منزل کی ہم اس لئے
ہوا پر چلے ، پر لگا کر چلے

☆

تمنا وہی ہے جو لب پر نہ آئے
لبوں پر جو آئے تمنا نہیں ہے
تصور کی موجوں پہ ناشاد پیہم
بہا جا رہا ہوں، کنارہ نہیں ہے

☆

الٰہی یہ کیا ربط ہم دیکھتے ہیں
خوشی میں بھی تصویرِ غم دیکھتے ہیں
ذرا تم ہماری نگاہوں سے پوچھو
تمہیں کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

☆

شگفتگی میں ہے پوشیدہ موت کی تلخی
ہر ایک گل سے پیام قرار آتا ہے

(تقریظ۔ مٹھی بھر غزلیں)

نورالہدیٰ

اور

دیارِ گم گشتہ

گذشتہ دس دنوں سے موقع نکال نکال کر میں جس تازہ ترین، شائع شدہ کتاب کا پوری دلچسپی اور دل جمعی سے مطالعہ کر رہا تھا وہ نوؔر بھائی کی کتاب ''دیارِ گم گشتہ'' ہے جو تقریباً تین سو صفحات کو محیط ہے جس کے کل نو ابواب ہیں۔ الگ سے ایک احوال واقعی بھی ہے جو ابتدائی صفحات پر درج ہے۔

صاحبِ کتاب کو جو اردو کے ایک مایۂ ناز انشاء پرداز اور صاحبِ طرز نثّار ہیں۔ جن کی نگارشات کی عظمت کو اردو کے مایہ ناز مدیروں، تنقید نگاروں اور قلم کاروں نے ملکی سطح پر تسلیم کیا ہے۔ انہیں میں نوؔر بھائی لکھ رہا ہوں۔ یہ میری جرأت کا کمال ہے لیکن مجھ کو یہ طریقہ خود انہوں نے سکھایا ہے۔ ''میں نے جناب شمس العارفین عرف عارفین بھائی سے انگریزی اور حساب کی کچھ بنیادی تعلیم حاصل کی ہے۔ انہیں میں اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن خود ان کی تاکید یہ تھی کہ میں انہیں ''عارفین بھائی کے نام سے مخاطب کیا کروں''۔

نوؔر بھائی میرے بزرگ ہیں۔ لکھمنیاں کے لئے ان کی ذات گرامی لائقِ افتخار ہے۔ لکھمنیاں کی سینکڑوں برس کی علمی ادبی تاریخ میں اس وقت وہ پہلے قلم کار ہیں کہ جنہوں نے سلیقے کی نثر لکھی۔ تحریر کی بوقلمونی اور شگفتہ بیانی جن کا طرۂ امتیاز ہے۔ جنہوں نے پڑھا زیادہ ہے، لکھا کم ہے۔ کم لکھنے کے باوجود ان کے کل بانوے (۹۲) مضامین ملک گیر سطح پر'' آج کل، نیا دور، آبشار، روحِ ادب، تہذیب الاخلاق، لاریب، فکر و تحقیق، زبان

وادب، اثبات ونفی، مژگاں'' جیسے بلند پایہ رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ان مضامین کے دو مجموعے ''ایجاد معانی'' جس میں سائنس اور سائنس دانوں پر لکھے گئے مضامین ہیں اور ''تخمین وظن'' تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ان دو مجموعوں کے علاوہ ایک سوانح حیات اور سفرنامہ ئسیر وسیاحت کے مشترک موضوع پر تحریر کردہ مایہ ناز تصنیف ''تذکار نظامی'' اور زیرِ نظر کتاب ''دیارِ گم گشتہ'' ان کی عظمتِ قلم میں چار چاند لگا رہی ہے۔

کتاب ہذا کے ''احوال واقعی'' کے ضمن میں انہوں نے جو رقم کیا ہے وہ لائقِ ملاحظہ ہے:

''کسی شخص کو کبھی مکمل زندگی نہیں ملتی اسی لئے داستانِ حیات کا مکمل اور جامع ہونا ممکن نہیں۔ جو کچھ لکھا ہے، دل برداشتہ اور اس جذبۂ انتقام کے تحت لکھا گیا ہے جو اب تک کی زندگی نے مجھے محرومی ومایوسی اور ناکامی کی شکل میں دیا ہے۔ پڑھنے والوں کے لئے اس میں کوئی پیغام، کوئی بصیرت نہیں ہے۔غبارِ خاطر کئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ان میں ایک اپنی سوانح یا روودادِ حیات بھی لکھنا ہے۔لیکن یہ بات تو ان لوگوں کو زیب دیتی ہے جو یکتائے روزگار ہوتے ہیں۔ نیوٹن سے مرتے وقت کسی نے پوچھا کہ آپ نے دنیا سے کیا سیکھا؟ ''علم کے سمندر کے کنارے بیٹھ کر کنکریاں چن رہا ہوں''۔اس کا جواب تھا۔ہماری پوری زندگی ایک اضطراری کیفیت سے دوچار رہی۔ جو آگے چل کر خوف وانتشار میں بدل گئی۔ یہ غالباً نتیجہ تھی اس غربت کا جو ابتدا سے آج تک دامنِ حیات سے لپٹی رہی۔چھوٹی چھوٹی باتوں سے کڑھتا رہا۔ دکھ، بیماری، سماجی ناہمواری، دین واخلاق کی زبوں حالی، مسلکی اور غیر مسلکی انتشار وبربریت۔ایک اکیلا غم ہو تو سہہ لے، اتنے سارے غموں کا مداوا کیا ہے''

(ص:۷۔۸)

جناب نور الہدیٰ کے والد محترم کا نام امر الہدیٰ تھا۔ بقول ان کے ان کا شجرۂ نسب کچھ اس طرح ہے۔ ''امر الہدیٰؒ بن محمد یسینؒ بن شیخ احمد علی بن شیخ صابر علی، بن شاعر علی بن شیخ ناصر علی بن شیخ سلطانؒ یعنی یہ سب کے سب اہلِ شیوخ میں سے تھے'' (ص:۱۸) ان کی دادیہال اور نانیہال دونوں لکھمنیاں ہی میں ہے۔ ان کے ماموں مولانا سید ضیاء الرحمانؒ کی ڈائری میں ان کا بھی سلسلۂ نسب درج ہے جسے اس کتاب میں منتقل کیا گیا ہے۔ نور الہدیٰ صاحب کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں لکھمنیاں ہی میں ہوئی۔ علم کا پہلا درس انہوں نے اپنی والدہ محترمہ بی بی احمدیؒ خاتون سے حاصل کیا۔ اردو کی چوتھی کتاب (مطبوعہ انجمن حمایت اسلام، لاہور) اور آمد نامۂ فارسی تک انہوں نے والدہ ہی سے پڑھا۔ اس کے بعد موڈل مکتب لکھمنیاں کے درجۂ اول میں داخل کرادئے گئے جہاں سے ۱۹۴۴ء میں درجۂ پنجم تک کی تعلیم پائی۔ اس وقت درجہ پنجم کا امتحان بھی بورڈ کا امتحان ہوا کرتا تھا جس کا مرکز امتحان شہر بیگوسرائے میں ہوتا تھا۔ ''پاس کرنے کے بعد مجھے بلیا ڈل اسکول میں داخلہ لینا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا'' (ص:۸۴)۔ والدین نے انہیں بہار شریف روانہ کردیا کہ جہاں ان کے ماموں جان مولانا ضیاء الرحمنؒ صاحب زیرِ تعلیم تھے۔ ماموں جان نے ان کے پڑھنے لکھنے کے لئے اس مدرسہ میں داخلہ کرادیا۔ جو درگاہ شریف کے احاطے میں تھا۔ وہاں انہوں نے کچھ انگریزی سیکھی اور کچھ حساب سیکھا۔ بقیہ اوقات یوں ہی ضائع ہوگئے۔ وہاں سے ایک سال بعد جب واپس آئے تو گھر کو حسب سابق نادار و بدحال پایا۔

''ماں میری جو پہلے سے نحیف ونزار تھیں اور کمزور ہوگئی تھیں .... پرائمری اسکول کا سرٹیفکیٹ اور چند روپے تھما کر والدہ نے کہا جاؤ بلیا ڈل اسکول میں داخلہ لے لو...... زندگی کے سفر میں کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی باتیں زندگی کا رخ موڑ دیتی ہیں اور کوئی معمولی سا واقعہ غیر معمولی نتائج پیدا کرتا ہے۔ جب میں نے ایڈمیشن رجسٹر پر سائن کیا تو یکا یک ہیڈ ماسٹر صاحب کا چہرہ کھل اٹھا اور تعریفی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ جو استاد

آفس میں آتے میرا دستخط انہیں دکھاتے اور تعریف کرتے۔ اسی روز انہوں نے اسکول کی فیس ہماری نصف کردی'' (ص: ۹۱۔۹۰)

اس طرح درجہ ششم و ہفتم کے امتحانات مڈل اسکول بلیا سے مکمل کرنے کے بعد ایس۔اے۔ایس ہائی اسکول کے درجہ ہشتم میں ۱۹۴۷ء میں داخل ہوگئے جہاں سے درجۂ یازدہم (میٹرک) کا امتحان امتیازی نمبرات سے ۱۹۵۱ء میں پاس کیا۔ پوری ریاست میں ان کا نمبر تیسرا تھا۔ حکومت بہار نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے پچاس روپے ماہانہ کی اسکالرشپ جاری کردی۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا۔ لکھمنیاں کے لئے بھی اور اسکول کے لئے بھی۔ اس کے بعد مونگیر کی پی ٹی فیکٹری کے انگریز مالکان کی جانب سے بھی (جہاں ان کے والد محترم ملازم تھے) ساٹھ روپیہ ماہانہ کی اسکالرشپ جاری ہوگئی۔ لیکن یہ رقم تین تین ماہ کے وقفہ سے ملا کرتی تھی اس لئے انہوں نے بھاگلپور کے مشہور زمانہ کالج ٹی۔این۔بی میں داخلہ کرالیا اور بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنے خورد و نوش کا نظم کرلیا۔ اس ٹیوشن نے ان کے ظرف وضمیر پر بار بار کچوکے لگائے۔ ان کچوکوں نے حوصلہ مندی پر ضرب لگائی اور وہ خوش شکستگی اور مایوسیوں کے شکار ہوگئے۔ ''غرض کہ ابتدائے عمر کی غربت اور مفلسی نے یہاں بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ چند مہینوں میں صحت خراب ہوگئی۔ محلّہ کے لوگ جو مجھے راج کمار کہہ کر پکارتے تھے ہماری بدشکلی کا شکوہ کرنے لگے'' (ص: ۱۵٦)۔

''جسمانی اور ذہنی طور پر کالج کے یہ دو سال انتہائی انتشار اور غیر ذمہ داری میں گذرے۔ امتحان کی تیاری کس طرح اور کتنی ہوئی مجھے یاد نہیں۔ صحت تو خراب ہو ہی چکی تھی۔ آدھے سر کا درد ستانے لگا۔ بے اعتدالیاں ساتھ تھیں۔ امتحان دے کر وطن لوٹ آیا۔ آئی۔ایس سی سکنڈ ڈویزن سے پاس ہوا'' (ص: ۱۵۹)۔

''بی۔ایس سی میں داخلہ لینے کے علاوہ دوسری راہیں بھی کھلی ہوئی تھیں ....لیکن تجربہ کی کمی، گائیڈنس کے فقدان اور جسمانی و ذہنی نا آسودگی نے کسی صحیح فیصلے پر پہنچنے نہیں دیا'' (ص: ۱۵۹)

جب فائنل امتحان کا وقت آیا تو ''ادھ کپاری'' کا شدید دورہ پڑا جو امتحان کی پوری مدت کو نگل گیا۔ چنانچہ امتحان دئے بغیر وہ گھر واپس آگئے۔

اسی سال وقت گذاری کے لئے انہوں نے کالجیٹ اسکول، بیگوسرائے کی معلمی قبول کرلی۔ جہاں انہیں زندگی کے نئے تجربات و مشاہدات سے واسطہ پڑا۔ ''۱۹۵۹ء میں بی۔ایس سی کا امتحان اوسط نمبر سے پاس کیا لیکن حساب میں اول درجہ کا نمبر رہا۔ مجھے لازماً ایم۔ایس سی میں داخلہ لینا چاہئے تھا لیکن والد صاحب مرحوم نے معذوری کا اظہار کیا'' (ص:۱۱۱)۔ چنانچہ مونگیر واپس آکر انہوں نے ایم۔ڈبلیو ہائی اسکول کی معلمی قبول کرلی۔ وہاں بھی انہیں ٹیوشن کے جھمیلوں سے نجات نہیں ملی۔

''پڑھنے لکھنے کا شوق اور حصولِ علم کی دھن اتنی شدید تھی کہ ۱۹۶۰ء میں ہم نے پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا'' (ص:۱۱۴)

''بھاگلپور کی زندگی اور پٹنہ کی زندگی میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ نا آسودگی اور فرار کی وہی کیفیت تھی بلکہ ان میں اضافہ بھی ہوگیا تھا۔ غربت جو بچپن میں شریک ہوئی، ہر جگہ موجود تھی اور تا دمِ تحریر بھی ہے'' (ص:۱۱۶)

''۱۹۶۲ء میں ایم۔ایس سی کا فائنل امتحان تھا....... امتحان سے چند ہفتے قبل سر کے درد کا دورہ پڑا جو تقریباً ایک ماہ تک پریشان کرتا رہا۔ غرض کہ سال ضائع ہوا اور وطن واپس آگیا''۔ (ص:۱۲۵)

''سال کے برباد ہونے کا مجھے غم نہیں تھا۔ اس سے بھی بڑے غم مجھ پر حاوی تھے جس کی کوئی شکل، کوئی شناخت نہیں تھی۔ زندگی کا انتہا پسندانہ نظریہ ہمیشہ دامن گیر رہا ...... ہماری سب سے بڑی بدبختی یہ تھی کہ ہم نے اپنے آپ کو وقت و حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ منزل کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مستقبل کا کوئی پروگرام سامنے نہیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ زندگی جس شکل میں آئے گی قبول کرلی جائے گی۔ یہ فیصلہ نہایت سخت اور تکلیف دہ تھا اور آگے یہی ہوا کہ زندگی کے لمبے سفر میں ایک بھی ایسا مقام نہیں آیا، جہاں تھوڑی

آسودگی حاصل ہو.....وطن مجھے اب بھی عزیز ہے۔ یہاں (کولکاتا) رہ کر بھی آسودگی کے اسباب وہیں سے حاصل کرتا ہوں" (ص:۱۲۵)

وطن کی سوندھی مٹی کا یہ رسیا، خاکِ وطن کو دیوتا کا مرتبہ دینے والا گھوم پھر کر وطنِ عزیز کی باتیں کرنے والا، حبِ وطن میں پوری سرشاری کی آرزو رکھنے والا پلٹ پلٹ کر یہی ذکر چھیڑ بیٹھتا ہے۔

"امتحان کا نتیجہ ویسا ہی نکلا جس کی امید تھی یعنی میں سکنڈ کلاس میں پاس ہوا۔ ایک دو ماہ گھر پر بیکار رہا۔ ہم نے اپنے گرد اپنی نئی دنیا بنالی تھی۔ ایسی دنیا جہاں انسان اپنے آپ کو ایک ہیرو تصور کرتا ہے۔ طبیعت میں حاکمانہ انداز تھے۔ مجھے انسانی زندگی کی چھوٹی چھوٹی برائیاں بہت بڑی لگتی تھیں۔ غربت اور تنگ دستی میں پلا ہوا انسان اگر شاہانہ دماغ رکھتا ہو اور ہنرمندیوں کے باوجود کامیابی میسر نہ ہو تو فرار اور قنوطیت کا پیدا ہونا لازمی ہے"
(ص:۲۹۔۱۲۸)

اسی طرح کے ذہنی تناؤ، تذبذب اور بے یقینی کے عالم میں انہیں آزاد اکیڈمی (مسلم ہائی اسکول) ارریہ میں معلم سائنس کی حیثیت سے بحال کرلیا گیا جسے انہوں نے بشوق قبول کرلیا۔ وہاں ان کی علمی، ادبی اور دانشورانہ حیثیت کی زبردست پذیرائی ہوئی جس سے انہیں نفسیاتی تسکین بھی حاصل ہوئی۔ "لوگ نہایت مخلص تھے۔ چھوٹی چھوٹی برائیاں جو مسلم معاشرے کی عام روایت ہے یہاں کے لوگ بہت حد تک ان سے پاک تھے۔ زیادہ تر لوگ کاروباری تھے اور صاحبِ علم کی قدر کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر شہر سے دور کسی گاؤں میں کسی دوست یا شاگرد کے یہاں دعوتیں ہوتیں اور اساتذہ کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی۔" (ص:۱۳۰)

ان تمام قدر دانیوں کے باوجود نوؔر صاحب صرف ایک سال آزاد اکیڈمی کی خدمت کر سکے۔ ۱۹۱۰ء میں وہ کلکتہ چلے گئے جہاں انہیں یہ امید تھی کہ اپنی حساب دانی اور ادب پروری، جس پر انہیں بڑا فخر تھا کا جوہر دکھا سکیں گے اور ہوا بھی یہی کہ یہاں ان کی

بھرپور پذیرائی ہوئی۔ گرچہ وہ اس سے مطمئن نہیں ہو سکے۔ وجہ صرف ایک تھی ؎

جچتی نہیں ہے کوئی بھی منزل نظر میں اب
گذرے ہیں لاکھ بار مہ و کہکشاں سے ہم (ظفر حبیب)

جس کی نظر میں مہ و کہکشاں ہو، جسے اپنی انانیت اور علمیت کو سرمایۂ حیات بنانے کا موقع ملا ہو، جو حالات سے زبردست پنجہ آزمائی کرتا ہوا اپنی کشتیٔ حیات کو موجوں سے نکالتا رہا ہو اور ڈالتا رہا ہو۔ وہ تو دراصل ایک مہم جو ہو چکا ہوتا ہے ایسے مہم باز اور ایڈونچرسٹ کو سکون قلب و نظر سے محروم ہونا ہی ہے۔ سو نورؔ بھائی کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔

''شہر کلکتہ اردو زبان کے ادیب و شاعر اور فنکاروں کے لئے زیارت گاہ تھا۔ داغؔ کی منّی بائی حجابؔ یہیں رہتی تھی۔ غالبؔ کو پری چہرہ لوگ کا تصور پریشان کرتا تھا اور وہ عظیم آباد میں رہ کر کلکتہ کی برسات کے انتظار میں رہتے تھے۔ (نورؔ بھائی مجازؔ کو بھول گئے جو کلکتہ کے غالباً روائیڈ اسٹریٹ پر شب و روز شمال تا جنوب اور جنوب تا شمال کے چکر کاٹتا کاٹتا گر کر مر گیا) لیکن مجھے کلکتہ پسند نہیں تھا۔ وطن کے کھیت، باغ اور دریا مجھے زیادہ پسند تھے (شاید اس لئے بھی کہ یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی/ وہ اس وادی کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی) کون جانتا تھا کہ زندگی کا نصف حصہ مجھے یہیں گزارنا ہوگا۔ آج کلکتہ آئے ہوئے ۴۶/ سال کا عرصہ گذر گیا۔ یہ تمام عرصہ میں نے ایک سزا یافتہ مجرم کی طرح بسر کیا''۔ (ص: ۱۳۳)

۲۳/ مارچ ۱۹۶۵ء کو مدرسہ عالیہ کے اینگلو پرشین ڈیپارٹمنٹ میں علقمہ شبلیؔ اور طیبؔ علی خاں کے ساتھ نورؔ الہدیٰ صاحب کا بھی تقرر ہوا۔ تیس برس تک سرکار بنگالہ کے اس مشہور روزگار ادارہ کی خدمت کے بعد ۱۹۹۴ء میں بعمر ساٹھ سال آپ سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد مولانا آزاد کالج میں واقع اقلیتی کوچنگ سنٹر برائے ملازمت میں تین سال تک سائنسی موضوعات بشمول حساب کا درس طلبائے کوچنگ کو دیتے رہے۔ ملازمتی زندگی کے

آخری مرحلہ میں آپ کے لئے یہ تسلی بخش اور سکون افزاء خدمت ثابت ہوئی۔ دو تین سال کے اندر ہماری سرپرستی میں بہت سارے لڑکے سول سرونٹ، ڈاکٹر اور انجینیر بن گئے۔ کلکتہ کی تدریسی زندگی میں یہ ہماری بڑی کامیابی رہی"۔(ص:۱۸۰)

گرچہ ہدیٰ صاحب کلکتہ سے مطمئن کبھی نہیں ہوئے۔"زندگی کا بیشتر حصہ وطن سے باہر گزرا۔"اس طرح ہمارے جسم اور روح کا بٹوارہ ہوگیا۔جسم تو وطن سے باہر بھٹکتا رہا لیکن روح مستقل طور پر وطن ہی میں رہی۔یہ ایک بڑا المیہ ہماری زندگی کا ہے جو مسلسل ذہنی اذیت کی شکل میں مجھے آج بھی ڈس رہا ہے"۔(ص:۱۴۸)

"بنگال کے شعرا کا خصوصاً مقصدِ حیات صرف اتنا ہے کہ اپنی غیر معیاری تخلیقات کے سہارے اردو کے نیم مردہ جسم سے شہرت اور نیک نامی کا جتنا خون بھی ہو، نچوڑ لیں۔دنیا کس طرف جا رہی ہے۔ملک وقوم تو بڑی چیز ہے۔خاندان اور معاشرہ کے تقاضے کیا ہیں، انسانی خدمت اور رفاہ کیا چیز ہوتی ہے۔ ان باتوں سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔یہی حال شہر کے مولوی اور ملاؤں کا ہے جو صبح سے شام تک گھر گھر میں دین کی برکتیں بانٹتے پھرتے ہیں"۔بقول اقبالؔ ۔

کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز
کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراقی

"علم زرداروں کی دہلیز پر شرمسار ہے۔ ملا و مفتی، شاعر اور متشاعر، سب کے یہاں زندگی کا تاجرانہ نظریہ ہے۔عزتِ نفس اور وقارِ علم کوئی مسئلہ نہیں...... مسجد کے امام بے علم اور بے عمل ہیں........اہلِ علم کی قدر نہیں۔ خدا ترس، پرہیز گار اور عابد وزاہد اپنا انصاف محلہ کے غنڈوں سے طلب کرتے ہیں۔حضرت شاہ ولی اللہ کے بقول۔

"ایک وقت آئے گا، جب نیک لوگ رذیلوں کی پناہ میں ہوں گے اور ان سے انصاف چاہیں گے۔جہلا تبلیغ دین کا پیشہ اختیار کریں گے"۔(ص:۱۵)

اس انداز کے تبصرے جا بجا ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل ایک جھنجھلاہٹ ہے ایک احساس نامرادی ہے۔ تمام اہلِ بصر ونظر کے حصہ میں یہی کچھ آتا ہے۔ وہ زمانہ سے لڑنا چاہتا ہے۔ اسے بدلنا چاہتا ہے۔ اگر اس کے اندر تحریکیت ہوتی ہے تو کسی نہ کسی طرح کی انقلابی تحریک میں شامل ہو جاتا ہے اور انقلاب کا بگل مسلسل پھونکتا رہتا ہے۔ نور صاحب ایک خالص دیندارانہ ماحول کے پروردہ تھے اس لئے کسی غیر الٰہی تحریک کے ہمنوا نہیں بن سکے اور جب جماعت اسلامی ہند کی تحریک سے وابستہ ہوئے تو کتابوں کی تقسیم سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس کے بعد اسے بھی لکھمنیاں ہی میں رکھ کر بھول گئے۔ اگر وہ تحریک سے وابستہ ہوتے تو آج اس قدر مضمحل، پژمردہ اور مایوس نہ ہوتے۔ زندگی کو نصب العین مل گیا ہوتا اور آخر دم تک وہ اس کی طرف بڑھتے ہی رہتے جس سے زندگی کی رمق کا پتہ چلتا۔

''زندگی کے اس لمبے سفر کو محرومی ومظلومی کے سفر سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا...... عقل وشعور وادراک میں وسعت تو تھی لیکن ہمت وتدبیر سے جو شعور زیست پیدا ہوتا ہے اس کا فقدان تھا۔ ذہن باغیانہ اور انقلابی لے کر پیدا ہوا تھا لیکن بغاوت وانقلاب جس حرکت وتوانائی کا تقاضہ کرتے ہیں۔ غربت وافلاس میں ایسے جوہر پیدا نہیں ہوتے'' (ص:۱۸۱)

ان تمام حقائق کے باوجود ہدیٰ صاحب کو کلکتہ نے وہ سب کچھ دیا جس کے وہ سزاوار تھے۔ اردو کی عظیم شخصیات، جمیل مظہری امیر رضا کاظمی، آل۔ احمد، وحشت کلکتوی، پرویز شاہدی، سالک لکھنوی، مجیب الرحمان، اعزاز افضل، علقمہ شبلی، ولی رضوی، امین احمد، غلام سرور، منصور عالم، افتخار احمد، محمد فیروز، ظفر اوگانوی، جاوید نہال، نصر غزالی، سمیع اللہ اسعد، خواجہ محمد یوسف، مولانا محفوظ الکریم معصومی وغیرہ جیسی شخصیات سے تعارف، ان کی صحبت، ان سے یارانہ یہ سب زندگی کی عظیم اور فقید المثال نعمتیں ہیں، جو ہدیٰ صاحب کو

کلکتہ نے عطا کیا۔ مذکورہ زعمائے ملک وملت اور دانشورانِ وقت نے ہدیٰ صاحب کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف اور احترام کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہیں اربابِ قلم اور بزمِ احباب جیسی علمی وادبی تنظیموں کی نہ صرف شراکت داری حاصل رہی بلکہ اس کے باوقار ناظم ومعتمد بھی رہے۔ کلکتہ ہی میں انہیں نیشنل لائبریری، امریکن سنٹر، برٹش کاؤنسل، ایران سوسائٹی، مغربی بنگال اردو اکیڈمی جیسے کتب خانوں اور مراکز علمی کی باوقار رکنیت حاصل ہوئی یہ سب ان کی علمدانی اور دانشوری کا صدقہ ہے۔ اب کلکتہ ان سے اگر یہ پوچھے تو کیا وہ حق بجانب نہ ہوگا۔ ع

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

اس کتاب کی وجہ تصنیف اس کا وہ مرکزی باب ہے جس کا عنوان ''میری بستی میرے لوگ'' رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ بار بار ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ اپنی بستی کی محبت جسے عشق کہا جاتا ہے کہ معاملہ میں جنون کی سرحدیں پھلانگ جانے والوں میں سے ہیں۔

''حب الوطنی ایک جذبۂ ازلی ہے۔ غریب الوطنی ایک سزا ہے جس کا کرب وہی جانتے ہیں جو وطن سے دور ہیں۔ لہذا اس تحریر کا محرک یہی جذبہ ہے اور یہ بھی کہ آج سے تقریباً ستر سال قبل کے حالات وواقعات کا علم آج کی نسل کو نہیں ہے'' (ص:۱۹۱)

اس تصنیف سے انہوں نے لکھمنیاں کی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی تاریخ سے آنے والی نسل کو روشناس کرانے کا ارادہ کیا ہے۔ جس میں بہت حد تک اور بہت دور تک انہیں کامیابی نصیب ہوئی ہے لیکن اس معاملہ میں انہوں نے تاریخی حوالوں اور ان کی تحقیقی جانچ پرکھ کا کام نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے چند اہم باتیں ہنوز تشنۂ تکمیل رہ گئیں۔ مثلاً انہوں نے یہ لکھا ہے کہ ''شمالی بہار کی غالباً یہ واحد بستی تھی جو اپنی زمیندارانہ سطوت وحاکمیت، علم وزبان، اخلاق وآداب اور تہذیبی روایات کی وجہ سے بالکل منفرد تھی۔ قدیم روایات کے مطابق اس بستی کے بانی حضرت شیخ سلطانؒ تھے، جن سے بستی کے بیشتر خاندان بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی نسبت قائم کر کے عزت واحترام پاتے ہیں'' (ص:۱۸۳)

یہ ایک اہم نکتہ ہے جو زمانہ دراز سے لاینحل ہے۔ راقم الحروف بھی اس موضوع پر پچھلے چالیس برسوں سے اپنا سر کھپا رہا ہے لیکن۔ ع

ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

کی کیفیت برقرار ہے۔ شیخ سلطانؒ صاحب سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک داعی دین حق تھے۔ جنہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے جید خلیفہ حضرت آدمؒ بنوری کا خلیفہ ہونے کا شرف حاصل تھا۔ مولانا ابوالحسنؒ علی ندوی کے بقول ان کے جد امجد شاہ علم اللہؒ صاحب تکیہ رائے بریلی اور شیخ سلطانؒ صاحب جن کے نام کے ساتھ بلیاوی بھی لگا ہوا ہے۔ یہ دونوں آدمؒ بنوری کے خلفائے اجلؒ میں سے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تاریخ کی کئی اہم کتابوں کے مطالعہ کے باوجود جو انگریزی اور اردو زبان میں ہیں ان دونوں حضرات کا ذکر نہیں ملتا۔ مولانا موصوف کے بموجب ان کا تفصیلی ذکر فارسی زبان میں رقم کردہ کتاب ''نتائج الحرمین'' میں ہے اور یہ کتاب اب تک نایاب ہے۔ میں آس لگائے بیٹھا تھا کہ جب ہدیٰ صاحب کی کتاب آئے گی تو وہ کچھ دور تک رہنمائی کا فریضہ میرے لئے انجام دے گی۔ اس نقطۂ نظر سے مجھ کو یہاں مایوسی نصیب ہوئی۔ لیکن اس سے اس تصنیف کا نہ وقار مجروح ہوا اور نہ اہمیت وافادیت میں کمی آئی۔ مصنف نے جس نیت سے یہ کتاب رقم کی وہ نیت بہت حد تک پوری ہوئی۔ اپنی بستی کا جائزہ اب ان کے الفاظ میں دیکھیے۔ ''قصبات اور شہروں میں سماجی اور سیاسی قیادت زیادہ تر زمینداروں، نوابوں اور راجاؤں کے زیر اثر تھی اور تمام سرگرمیاں انہیں کی سرپرستی میں انجام پاتی تھیں۔ جاگیردارانہ نظامِ زندگی کی ساری بدصورتیاں اور قباحتیں موجود تھیں۔ ہماری بستی نوابوں اور زمینداروں کی بستی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں سرکار انگلشیہ کی خدمات اور وفاداری کے صلے میں جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ لاکھوں کی سالانہ وصولی ہوا کرتی تھی'' (ص: ۱۸۳)

''فیوڈل اور آمرانہ نظامِ حیات کے اثرات تمدن کے ہر شعبے میں نمایاں تھے۔

سالانہ مال گذاری نہیں ادا کرنے پر کھیت کٹوا لئے جاتے۔ کھلیانوں سے غلہ اٹھوا لیا جاتا، مکانات کی قرقی ہو جاتی تھی۔ بعض سرکش رعیت کو جسمانی سزائیں دی جاتیں۔ ان باتوں سے محل کا وقار قائم رہتا اور رجواڑوں کے نفس کی تسکین ہوتی۔ یہ تمام افعال و کردار قانونِ فطرت کے منافی تھے۔ فرد ہو یا قوم، حاکم ہو یا محکوم، بادشاہ ہو یا گداگر، جس کسی نے ان قوانین سے انحراف کیا ہے اسے ہزیمت اٹھانی پڑی ہے...... ۱۹۵۰ء میں زمینداری سسٹم ختم کر دی گئی..... یہاں کے زمیندار راتوں رات قلاش اور مفلس بن گئے....... اب صرف اللہ کا نام ہے، خستہ حال مکانات اور عمارتیں عبرت کی داستان سنا رہی ہیں۔ وسیع کھنڈر کے درمیان کچھ باقیات ہیں جو ماضی کی یاد دلاتی ہیں .... (اب وہاں) راتوں کو کتے روتے ہیں اور دن کو خنزیر کی ٹولیاں چکر لگاتی ہیں" (ص: ۱۸۴)

"جب عیش و عشرت کے وسائل تھے اور گھر بیٹھے لاکھوں کی وصولی میسر تھی تو فکر معاش تھی نہ تعلیم و تربیت کی ضرورت۔ ہاتھوں سے کام لینا چھوڑ دیجئے تو بازو شل ہو جاتے ہیں۔ دماغ سے کام لینا ترک کر دیجئے تو حافظہ مفلوج ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نواب کے یہاں ایک دو پاگل ضرور ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب کوئی پاگل نہیں ہوتا"۔ (ص: ۱۸۵)

اسی طرح انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ان کی بستی مسلم لیگ کا گڑھ تھی۔ ۱۹۴۶ء میں وہاں مسلم لیگ کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا۔ لیکن یہ تحریک نہ ہندی مسلمان کے لئے مناسبِ حال ہو سکی اور نہ باشندگانِ لکھمنیاں کے لئے۔ ہدیٰ صاحب لکھتے ہیں کہ "مسلم لیگ والے سات کروڑ کی آبادی کو آزاد کرانے کے لئے دس کروڑ مسلمانوں کو غلام بنا کر چلے گئے" (ص: ۱۸۳) پھر وہ اس غلامی کے اہم ترین اسباب بیان کرتے ہیں۔ "ملک کی تقسیم مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بالکل غیر فطری تھی۔ ہندو قیادت اس بات کو جانتی تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ اشتراک حکومت ممکن نہیں۔ مسلمانوں کے پیچھے ہزار سالوں کی حکمرانی اور بادشاہت کے تجربے اور نفسیات تھی۔ ان کے ساتھ رہ کر ہندوازم کا احیا ممکن نہیں

تھا‘‘۔(ص:۱۸۶)

یہ ایک سچی اور کھری بات ہے کہ جس سے موجودہ نسل کو واقف ہونا لازم ہے تاکہ اپنے مستقبل کا نقشہ وہ اس کی روشنی میں ترتیب دے سکیں۔ ’’برادرِ وطن کے یہاں ہر شعبۂ زندگی میں عروج ہے۔ ہر گھر میں وکیل، انجنیئر، ڈاکٹر، پروفیسر یا سول سرونٹ ملتے ہیں۔ پولیس، فوج اور دوسرے اہم اداروں میں ان کی نمائندگی ہے۔ اس عروج نے ان کے اندر احساس برتری پیدا کر دی ہے۔ جس کے اثرات ہندو مسلم تعلقات پر بھی پڑتے ہیں..... یہ گروہ مسلمانوں کے کھیتوں سے فصل کاٹ لیتے ہیں یا مویشی سے چروا دیتے ہیں..... ان کی تمام تر جارحیت، نفرت، منافقت اور ایذا رسانی صرف مسلمانوں کے لئے ہے۔ ۶۵ رسالوں کی غلامانہ زندگی نے اس کے (مسلمانوں کے) افعال و کردار سے ساری خوبیاں چھین لی ہیں‘‘ (ص:۱۸۷)۔

اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کی تصویر کشی کی ہے۔ ’’اردو زبان جو ہماری تہذیب تھی، کسی گوشۂ تنہائی میں سر چھپائے زندگی کی دہائی دے رہی ہے۔ ہندی زبان کا غلبہ ہے۔ شرفا اور پڑھے لکھے لوگوں کے گھر میں ہندی کے رسائل عام ہیں۔ اردو کے رسائل کہیں نہیں نظر آتے۔ زبان کیا بدلی..... گفتگو کے انداز بھی بدل گئے۔ ذہن بدلا، انسان کے چہرے بھی مسخ ہو گئے نہ ان کی گفتار میں لذت، نہ ان کے کردار میں ندرت۔ ہر شعبۂ زندگی میں انتشار و ابتذال ہے‘‘۔(ص:۱۸۸)

مذہب پرستی اور دینی شعار اس بستی کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ بستی میں چند نفوس ایسے ضرور ہوتے تھے جو اپنی دینداری، علم و تقویٰ کے اعتبار سے محترم سمجھے جاتے تھے..... مذہب کا انقلابی اور اجتہادی تصور نہیں ہونے کے باوجود وہ ملک کے اعلیٰ دینی مدارس کے باضابطہ سند یافتہ ہوتے تھے..... اب خود بستی کی مسجدیں اور مدارس کے لئے صاحبِ علم نہیں ملتے.. مسجد کے منبر و محراب اب ان سجدوں کے لئے ترستے ہیں۔ صوفی و ملاّ

کی سادہ اوراقی نے اس دین فطرت کو بدنام کر رکھا ہے..اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ خود انہیں اس انحطاط کا احساس نہیں ہے" (ص:۸۹۔۱۸۸)

"اس بستی کو سب سے زیادہ خاندان پرستی اور جھوٹی یا سچی نجابت نے نقصان پہنچایا ہے۔آزادی کے بعد مسلمانوں میں جب فکری اور نفسیاتی غلامی آئی تو ہڈی پوجنے کی یہ بیماری اور مہلک شکل اختیار کرگئی۔خصوصاً جو لوگ معاشی، اخلاقی، تہذیبی اور علمی طور پر قلاش ہیں۔اس مہلک مرض میں زیادہ مبتلا ہیں۔یہاں تک کہ شیخ مذکور کی ذات بابرکات بھی اس ذہنی نجاست سے محفوظ نہیں رہ سکی ہے" (ص:۱۸۹)۔اس باب کے اخیر میں انہوں نے لکھا ہے کہ "آج میں زندگی کے اس مقام سے اپنی بستی کی آبادی کو دیکھتا ہوں تو سوائے ملال اور مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا" (ص:۱۹۰)۔

یہاں تک اس کتاب کے کل چار ابواب کی باتیں تھیں جن کے اہم نکات درج کئے گئے کہ یہ ساری باتیں صرف باشندگان اور نوجوانِ لکھمنیاں ہی کے لئے نہیں ہیں بلکہ یہ ان کا خطاب عام ہے جو لکھمنیاں کے حوالہ سے کیا گیا ہے۔اس کے بعد اور بھی پانچ ابواب ہیں جن میں صاحبِ کتاب نے لکھمنیاں کی اہم شخصیات، شعراء، ادباء، علماء، شرفاء، زعماء، احباب اور اساتذہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔اس ذکر خیر میں حتی الوسع انہوں نے توازن اور فراخ دلی کا مظاہرہ کیا جن سے انہیں زک پہنچا ہے ان کا بھی ذکر یہاں موجود ہے۔جن سے ایک آدھ سبق بھی پڑھا ہے ان کا بھی ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔اس طرح لکھمنیاں کے اصحاب واشخاص جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ان سے بھی تعارف کرایا گیا ہے اور ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جو اس وقت موجود ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر کچھ نہ کچھ کرتے نظر آرہے ہیں۔

ایسے لوگوں میں مولانا محمد یحییٰ شیداؔ، پروفیسر شاہ کلیم الرحمٰن، شاہ خلیل الرحمٰن، مولانا ضیاء الرحمٰن، مولانا شمس الضحیٰ، مولانا زین الاسلام، مولانا شاہ بلالؔ، ڈاکٹر مہدی حسن، فضل الرحمٰن معید، ملاّ ڈاکٹر ولی الزماں، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر محمد شفیع، پروفیسر مفتی محمد

افضالؔ، شاہ محمد قاسمؔ، عطاء الرحمٰنؔ، عبادؔ الرحمٰن، مولوی تمیزؔ الدین، مولوی محمد ریاض الحق، مولوی ریاضت حسینؔ، ماسٹر ابوؔ محمد، چودھری جمیلؔ الزماں، مولوی محمد نعمانؔ، مولانا شاہ حبیبؔ الرحمٰن، حاجی عبد الشکورؔ، شاہ غلامؔ احمد، شاہ شمس العارفینؔ، سید محمد حمزہؔ، مولانا بدر الدینؔ (بڈو بابو) ماسٹر حفیظؔ الدین، چودھری یعقوبؔ، چودھری محمد لطیفؔ، ماسٹر محمد رضوانؔ، موتیؔ بابو، تارا بابو، جئے نرائنؔ بابو، بھولاؔ بابو (سبھی اساتذہ کرام) چھیدیؔ بابو ہیڈؔ ماسٹر، پروفیسر چکرورتی، پروفیسر بنرجیؔ، پروفیسر صدر الدینؔ، پروفیسر عبد الاحدؔ، ڈاکٹر نریندر ناتھؔ، ڈاکٹر قمر الدجیٰ، ڈاکٹر کپلؔ دیو پرساد سنہا وغیرہ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ انہوں نے ان تمام اساتذہ کرام کا بھی ذکر کیا ہے جن سے انہوں نے ابتدائی سے اعلیٰ درجات تک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے دوستوں میں انہوں نے اپنے ایک غیر مسلم بھومیہار دوست سنیل کمار شرما اور ان کے پورے گھرانہ کی اخلاق مندی، انسان دوستی، وسیع النظری، محبت، رفاقت، تعاون اور ہمدردی کا بڑے ہی شد و مد سے اور پوری تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

اس طرح یہ کتاب صرف ان کی اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی کہانی ہی نہیں بلکہ ایک عہد کی داستان اور مزاج و منہاج کا بیان ہے۔ زمانے کی کروٹوں کی جھلکیاں ہیں، دوست احباب کی محبتوں کا بیان ہے، اساتذہ کرام کی شفقتوں کے تذکرے ہیں، والدین کے پیار، ان کی تعلیم و تربیت کی یادیں ہیں۔ حالات کی ستم ظریفیوں اور بدخواہوں کی بدخواہیوں کی تصویر کشی ہے۔ یہ کتاب تاریخی نقطۂ نظر سے کمزور ہے لیکن تاریخ کی ترتیب کے لئے بنیادی حوالہ کی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کا آغاز ذاتی محرومیوں کے ذکر سے ہوا ہے۔ حالات کی ناگفتہ بہی اس میں دکھائی گئی ہے۔ زمانے کے ستم کی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ اس کا کینواس اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ جہان بھر کے مسائل اس کے احاطۂ تحریر میں شامل ہو گئے ہیں۔

البتہ تکرار کی جو روش اختیار کی گئی ہے اس سے اس کے حجم میں غیر ضروری اضافہ ہو گیا ہے۔ بعض وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کتاب صرف شکوہ شکایات کا پلندہ ہے لیکن تمام تفصیلات پڑھ جانے کے بعد صاف محسوس ہوتا ہے کہ نور الہدیٰ صاحب ہی کے لئے کسی نے یہ شعر لکھا ہے ؎

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا اسے لوٹا رہا ہوں میں

''ابتداً یہ کتاب اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اول تو یہ کہ کتاب حیات کے اوراق میں ایک بھی حرف معتبر نہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی ذات بھی تو وطن اور اہلِ وطن کی اجتماعی شناخت کا ایک حصہ ہے۔ لہذا اپنے آپ کو اجتماعی تہذیب وتمدن سے الگ رکھا جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے..... آزادی سے قبل اور اس کے بعد کی وہ شخصیتیں جو اپنی ذات میں انجمن تھیں اور قدیم وضع داری اور روایات حسنہ کی عملی تصاویر اس کتاب میں جگہ نہیں پا سکیں..... اب کوئی نہیں پوچھتا کہ ہمارے بچپن کا دوست علی حیدرؔ (قمر حمیدؔ کا چچا زاد بھائی) وقت اور حالات کی نامہربانیوں سے علم وادب کی روشنی اپنے سینے میں چھپائے ہوئے سڑک کے کنارے ہوٹل کے بینچ پر کیوں اداس بیٹھا رہتا ہے۔..... ملا اخترؔ، چودھری انظارؔ، عبدالودودؔ، فیاضؔ وغیرہ غریب الوطنی کے لمبے سفر میں کن محرومیوں سے گزرے کہ وطن کی دو گز زمین بھی میسر نہیں ہوئی۔ یہ گاؤں جو محبت اور پیار کرنے والے لوگوں کا گاؤں تھا، شاعر وادیب کا مسکن اور تہذیب وشائستگی کی آماجگاہ تھا جسے فخر سے بہار کا لکھنؤ کہتے تھے اب اتنا بدحال کیوں ہے؟'' (ص: ۳۰۳)

اپنا یہ محاسبہ، محاکمہ اور معائنہ ختم کرنے سے پہلے ہدیٰؔ صاحب ہی کا حوالہ رقم کرنا چاہوں گا ''آج کا مسلمان کل کے ڈوم چمار اور مہتر سے بھی بدتر ہے۔ آسودگی، سکون تو کیا ٹھہرنے کے لئے زمین تنگ ہو گئی ہے..... یہ حال غیروں کا ہے۔ اپنوں کے حالات زیادہ

افسوسناک ہیں۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ کی غلامی نے ان سے وہ ساری خوبیاں چھین لی ہیں، جن سے مسلم معاشرے کی شناخت ہوتی تھی.....اس بستی کا حال یہ ہے کہ جو کبھی عالموں اور دین کے مبلغوں کی بستی کہلاتی تھی۔ نماز ختم ہوئی تو دیکھا کہ ایک جاہل شخص تبلیغ کے لئے آمادہ ہوا۔ آپ لوگ ٹھہر جائیں دین کی باتیں ہوں گی" (ص:۲۸۷) بے شک شاہ ولی اللہؒ کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوگئی کہ "ایک وقت آئے گا جب جہلا تبلیغِ دین کریں گے" (ص:۲۸۸)

"اپنی زندگی کے حوالے سے ہم نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے ہماری جذباتی زندگی کی صحیح عکاسی نہیں ہوتی ہے اور نہ اس میں وہ حسن بیانی اور لطفِ تحریر ہے جو زباندانی کے لحاظ سے پڑھنے والوں کو راغب کر سکے۔ اس تحریر کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم اپنے ماں باپ کو یاد کرلیں اور انہیں تہنیت پیش کریں۔ ان کی زندگی میں ان کے حقوق ادا نہیں کر سکا" (ص:۲۸۶) لہذا یہ تحریر دراصل اعترافِ پشیمانی اور اقرارِ گناہ کی دلیل ہے"۔ اس لئے آنے والی نسل کو ہدیٰؔ صاحب کی یہ نصیحت حرزِ جاں بنالینا چاہئے کہ "کسی انسان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے کو میدانِ کارزار میں سمجھے۔ اگر وہ زندگی میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو دستِ دعا پر بھروسہ نہ کرے بلکہ دستِ طلب کو جرأتِ گستاخ سکھائے" (ص:۲۸۹)۔

☆☆

مجنوں موںگیری

اور

محسوساتِ مجنوں

نیاز فتحپوری کا خیال ہے کہ:

"شاعری ایک جذبہ ہے اس میں صداقت ہوتی ہے اس کی حیثیت جذبۂ حسن کی ہے اور یہ جذبہ قوت کا کام کرتا ہے۔"

اگر یہ بات نام لئے بغیر بھی کہی جائے تو اس پوست کندہ حقیقت کا اعتراف کر لینے میں کسی بھی ذی فہم کو کچھ بھی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہئے۔ کسی بھی شعری تخلیق کا مطالعہ کرتے وقت ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے۔ البتہ بات جہاں پر آ کر رک جاتی ہے اور نشان سوال بناتی ہے وہ پسندیدگی یا ناپسندیدگی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی نیاز فتحپوری کی ہی ایک بات قارئین کی رہنمائی کرتی ہے۔ "بلاشبہ دنیا میں حقیقت نہیں بدلی جا سکتی اور پھر مذاق انسانی کے اختلافات سوا تعبیر کے کسی اور چیز کے متعلق ہو ہی نہیں سکتی، شاعری حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے، صداقت نہیں ہے بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے۔ خود کوئی کیفیت نہیں ہے بلکہ کیفیت کا ایک بیان ہے اور بیان تعبیر کا، اختلاف کا، فطرت انسانی ہے اور جب ہم اس حقیقت کو تسلیم کریں گے جس کا کسی دوسرے شخص سے متحد ہونا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔"

یہاں ایک دوسرا مسئلہ سر اٹھا سکتا ہے کہ جب دو اشخاص کے نقطۂ نظر کا متحد ہونا ناممکن نہ سہی دشوار ضرور ہے تو پھر کوئی کسی کی تحریر، تقریر، تصویر اور تعبیر پر کیوں توجہ دے۔ پھر تو بات اس پر ختم ہو جائے گی کہ لو بھائی تم اپنی دنیا میں خوش، میں اپنی دنیا میں خوش، میرا تیرا کیا واسطہ۔ تب ساری دنیا کے فن پاروں کو لقمۂ سمندر بنا دینا ہی بہتر قرار پائے گا۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا، ہر خالق اپنی تخلیق دوسروں کے حضور بصد شوق رکھتا ہے اور اس کے دل میں ہر لمحہ یہ تمنا کروٹ لیا کرتی ہے کہ اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اگر خوش بختی سے کسی نے اس کی جانب نگاہ التفات کر دی تو بس یہ سمجھئے کہ خالق اپنی ساری محنت کو سوغارت ہوئی مان لیتا ہے۔ اس سے اسے ایسی مسرت حاصل ہوتی ہے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر غالبؔ کا یہ شعر ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

حقیقتاً صلہ اور ستائش کی تمنا کی بازگشت ہے، یہ اور بات ہے کہ غالبؔ پرستوں نے غالبؔ کو حد درجہ کا خوددار اور اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر غیور اور متکبر کے تاج وطوق سے نواز دیا ؎

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

منطق کا ایک نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز نہیں، نہیں ہے۔ ہر چیز ہے اور مسلمہ طور پر ہے۔ اس نکتہ کی منطق یہ ہے کہ ایک شخص جیوں ہی کسی چیز کے وجود سے انکار کرتا ہے ویسے ہی وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ شئے ہے اور یقینی طور پر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غالبؔ جو خود کو آزاد و خود بیں کہا کرتے تھے ان کے اندرون میں ستائش کی اور صلہ کی تمنا کروٹیں لیا کرتی تھیں۔ اسی لئے وہ شاکی تھے کہ انہیں یہ نعمت عظمہ ملے اور ضرور ملے۔

سید حسن مجنوںؔ مونگیری ایک روایت پسند اور کلاسیکی شاعر ہیں جو اپنے دل میں یقینی طور پر یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ان کے اشعار کو بھی پسند کیا جائے ان کی ستائش کی جائے اور انہیں داد و تحسین سے نوازا جائے۔ ''محسوسات مجنوں'' دل کے نہاں خانوں میں سوئی ہوئی انہیں تمناؤں کا اعلان و اظہار ہے۔ ؎

جگر کے خوں سے لکھی تھی تم نے جو داستانِ حیات مجنوںؔ
وہ منظر عام پر نہ آئی، کسی نے اب تک سنا نہیں ہے

غزل کی شیدائیت کا ذرا عالم دیکھئے، کس خوبی سے غزل کی تعریف کرتے ہیں ۔

جس کی رفعت کو نہ چھو سکتی کوئی صنفِ خیال
اس کے پاکیزہ عناصر کا پڑا نام غزل
اس کے اوصاف حمیدہ کے نگہبان ہیں ہم
صحبت بوالہوساں میں نہ ہو بدنام غزل
کسی میخوار کہن سال کے دل کی تھی پکار
ہوئی انداز بلا نوش پہ الہام غزل

دراصل دل کی یہی وہ آواز ہے جس نے مجنوںؔ کو اس بات کے لئے مجبور کیا ہے کہ وہ اپنی ''محسوسات'' کو کتابی شکل میں آپ کے سامنے رکھیں اور کہیں ۔

کوئی انصاف کر دے ہم نے سب کے سامنے عاجز
کچھ ان کی داستاں رکھ دی کچھ اپنی داستاں رکھ دی (کلیم عاجزؔ)

اب آپ کے ہاتھ میں میزان انصاف ہے لیجئے اور محسوسات کے اوراق الٹئے۔ ان اوراق کو الٹتے وقت یہ بات بھی یاد رکھئے کہ مجنوںؔ صاحب صرف ایک غزل گو شاعر ہیں۔ غزل اور صرف غزل جی ہاں! وہی غزل جس کی تعریف وہ اشعارِ بالا میں کر گئے ہیں۔

مجنوںؔ نے اپنی غزلوں میں جدت طرازی اختیار کر کے انسانیت سے محبت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے یہاں ایک حقیقی محبوبہ ہے جو جیتی جاگتی، ہنستی بولتی، پردہ نشین و بے پردہ، عشوہ طراز و نازک ادا، دلربا و توبہ شکن، شیریں سخن و شیشہ بدن، غنچہ دہن اور خوش لحن ہے، یہی ان کی شاعری کا جسم و جان ہے یہی ان کے فن کی آبرو ہے۔ یہی ان کے تصور کی آن بان ہے۔ انہیں تمنا ہے تو اسے پانے کی۔ انہیں خواہش ہے تو بس اس سے مل جانے کی۔ انہیں دکھ ہے تو اس کی جدائی کا۔ انہیں غم ہے تو اس کی بے وفائی کا۔ ان کی راتیں اسی کی عنبریں زلفوں سے مہکتی ہیں اور ان کی صحبتیں اسی کے رخساروں کی جگمگاہٹ سے چمکتی ہیں۔ ان کے خیالات کی مہک، ان کے دل کی تپک اور ان کے اندیشوں کی دھمک سب کی سب اسی محبوب کی مرہون منت ہے ۔

رشک ماہ مبین ہے پیارے
تو بھی کتنا حسین ہے پیارے

☆

آبتاؤں کہ زندگی کیا ہے
مستقل اضطراب کا عالم

☆

مجھے کیوں ہو تجھ سے شکایتیں، کہ یہ سب ہیں تیری عنایتیں
ترا غیض بھی ترا فیض بھی یہ اذیتیں ، یہ مسرتیں
مری جاں ترا یہ گلا نہ تھا ترے حسن و ناز پہ تبصرہ
مری داستاں میں کہیں کہیں جو لطیف سی ہیں عبارتیں

☆

تری داستاں ادھوری مرا قصہ نامکمل
نہ کسی کا ہو تعارف نہ کسی کی جزو بندی
مجھے اپنی رہ گذر پر نہ چلا سکا زمانہ
نہ جھکا سکی زمانے کو مری نیاز مندی
اسی مرحلے پر الجھے تھے مزاج دو دلوں کے
کہیں ذہنیت کی پستی، کہیں ظرف کی بلندی
مرا دہر بھی اندھیرا، جو حرم نہ تیرا روشن
یہ عروج کور فہمی، وہ زوال ہوشمندی
حقیقت نہ ہو جائے اک دن فسانہ
انہیں دیکھئے پھر رہا ہے زمانہ
کسی کے تصور کی وجد آفرینی
غزل جیسے چھیڑے کوئی والہانہ

☆

غرور و ناز کے آئیں بدل گئے شاید
وہ زخمِ دل پہ مرے رکھ رہے ہیں کیوں مرہم

☆

مری خودسپردگی پر کبھی ہنس دیا تھا تونے
تری ہر کشیدگی پر کبھی رودیئے تھے ہم بھی

☆

کبھی دل کے آئینے میں ترا عکس پا کے روئے
کبھی دل سے تری یادوں کو بھلا بھلا کے روئے
مجھے تیری انجمن میں نہ ملا وہ داستاں گو
جو مجھے رلا رلا کے ، جو ہنسا ہنسا کے روئے

☆

قفس کا در کھلا چھوڑا گیا ہے
بڑھے ہوتے جو میرے بال و پر بھی

☆

گذری ہے یوں بھی زندگی اب کے انتظار میں
ہنستے رہے خزاں میں ہم روتے بہار میں

☆

تیری مشیتوں کا یہ جبر دیکھنا پڑا
رو نہ سکے خزاں میں ہم ہنس نہ سکے بہار میں

☆

تم تماشہ ہی سمجھ کر آ تو جاؤ بام تک
کاندھا دینے آگئی ہے گردشِ ایام تک

☆

دے کے غم کہتے ہیں کس انداز سے
تجھ پہ میری مہربانی ہوگئی

☆

کوئی کسی کا کیوں ہو دشمن
گلشن کے سب ، سب کا گلشن

دیدۂ مجنوںؔ حیراں حیراں
جلوۂ لیلیٰ چلمن چلمن

قلم ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتا، نگاہ انتخاب یکے بعد دیگرے اگلے شعر پر پڑتی ہی چلی جاتی ہے۔ اس لئے اب اس انتخاب اور تلاش کا مسئلہ قاری پر چھوڑتے ہوئے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مجنوںؔ صاحب کی شاعری کا صرف یہی ایک رنگ ہے، مجنوںؔ صاحب نے زندگی کے اور بھی بہت سارے موضوعات پر قلم آزمائی کی ہے جس میں اپنی ناکامی اور نامرادی کا اظہار، اہل جفا کا شکوہ، زمانہ کی نامساعدت کا گلہ، اہل ہوس کی درندگی، دوشیزہ فن کی محبت اور اسے نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش، اسے جلا دینے اور صیقل کرنے کے لئے اپنے خون جگر کی آمیزش کا اعلان بھی انہوں نے کیا ہے۔ اس نوعیت کے اشعار بھی جاذب توجہ ہیں۔ نگاہ انصاف سے اگر آپ خود ان کے ''محسوسات'' کا معائنہ کریں گے تو میرے دعوے کے وافر ثبوت بکھرے پڑے ملیں گے۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں ۔

جنوں کی حد سے جو گذرے جنوں جنوں نہ رہا
جو ہوش میں کبھی آئے تو آگہی نہ رہی

☆

وہیں سے لیکے میں آیا ہوں آج تشنہ لبی
جہاں پہ مستی بھی ارزاں، شراب بھی سستی

☆

بہت اونچا مقامِ دل ہے لوگو!
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گذر بھی

☆

یہ ایک دجلۂ آتش ہے جس کا نام ہے عشق
اجل سے ہاتھ ملا تب عبور ہوتا ہے

☆

کون کسی کے درد کو جانے کون کسی کا غم پہچانے
شمع بھی تنہا، شعلہ بھی تنہا، سب پروانے تنہا تنہا

غزل میں تصوف روز اول سے ذکر محبوب کے شانہ بہ شانہ موجود رہا ہے۔ صوفی شعرانے بادہ وساغر کا سہارا لے کر مشاہدۂ حق کی گفتگو کی ہے اور خوب خوب کی ہے۔ محولہ اشعار کی تائید کر رہے ہیں۔

مجنوں صاحب نے بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہونے کی وجہ سے صوفیانہ موضوعات پر بھی جا بجا قلم آزمائی کی ہے۔ اس راہ میں بھی انہیں کامیابی نصیب ہوئی ہے چند اشعار مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں ؎

زندگی آزاد بھی محصور بھی   آدمی مختار بھی مجبور بھی
ہر نفس اک امتحانِ آرزو
ہر قدم پر دار بھی منصور بھی
حسن کو اپنی تجلی پر غرور
دل محبت کے نشے میں چور بھی

☆

حریمِ ناز کے پردے تو چاک ہو جاتے
نگاہ شوق مگر تھی نہ سرکش و بیباک

ضرورت آن پڑی ہے نگاہ ثانی کی
الٰہی تیری یہ تخلیق ہے بہت غم ناک

☆

اپنا فن دیکھ یہ بے معنی سی تحریر نہ دیکھ
ہم ہیں کس حال میں اے کاتبِ تقدیر نہ دیکھ

☆

دونوں ہی سے قائم ہے یہ کارگہِ عالم
اک رحمتِ بے پایاں، اک جرم خود آگاہی

☆

دامن ترے کرم کا مجھے تھامنا پڑا
دنیا کی بے رخی بھی بڑا کام کر گئی

☆

نہ اس مکاں کے لئے ہے نہ اس مکاں کے لئے
مری جبیں ہے ترے سنگ آستاں کے لئے

☆

بڑی بے انصافی ہوگی اگر میں مجنوںؔ صاحب کی شاعری کا وہ رخ نظر انداز کر جاؤں جوان کی نجی زندگی کا آئینہ دار ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ علم وادب کے ماحول میں پروان چڑھے۔ بچپن سے آج تک وہ عزت کی زندگی گذار رہے ہیں، نیک دل، شریف النفس، حق پرست، حق گو، سرکاری ملازمت بھی کی، مگر مروجہ رشوت ستانی سے دور رہے، دو بیویوں کا یکے بعد دیگرے طویل بیماریوں کے بعد داغِ مفارقت دے جانا، اپنوں کی عیاری، ماحول کی بے وفائی اور حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہونا۔ یہ وہ حقیقتیں ہیں جن سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ یہ کوائف ان کے اکثر و بیشتر کلام میں نمایاں ہیں ان کی ہر غزل

میں ایسے اشعار ضرور ملیں گے جو رقم کردہ مذکورہ عبارت کی تصدیق کر دیں گے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں ۔

دلِ نامراد کے حوصلے جو بہل بہل کے مچل گئے
کبھی جام شوق میں ڈھل گئے کبھی چشم تر سے ابل گئے

☆

کبھی زندگی کو کمال ہے کہیں زندگی کو زوال ہے
کہیں تخت و تاج ہے زندگی کہیں کھنچ رہی ہے یہ دار پر

☆

کسی پر فیض کی بارش کوئی محروم قطرے کو
یہ افسانہ تری محفل کا درد انگیز ہے ساقی

☆

مری تہی دامنی کی غیرت نے اِذنِ شکوہ دیا نہیں ہے
وگرنہ اے رحمت دو عالم تری خدائی میں کیا نہیں ہے

☆

زندگی یوں بھی گذاری ہم نے
زندہ رہنا کوئی فن ہو جیسے

اس طرح کے اشعار کیا ہیں، ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز ہے، ایک ستم رسیدہ انسان، زمانے کی ٹھوکر کھایا ہوا، یاس و بے کسی کا مارا ہوا، ان کے سوا کون کہہ سکتا ہے، ملازمت سے برطرفی کے بعد جیونہی عسرت کی زندگی سے واسطہ پڑا تو دل برداشتہ ہو کر اس حقیقت کا اظہار کس خوبی سے کر دیا ۔

تھی نہ آسودگی پہلے بھی کبھی اے مجنوںؔ
اب تو پینشن پہ گذارا ہے بڑی مشکل سے

قومی یکجہتی پر لکھتے لکھتے ایک جگہ کیا خوب کہا ہے ۔

ایسے عبرتناک مناظر ان آنکھوں نے دیکھے ہیں
اپنوں کی بھی نفرت دیکھی غیروں کا یارانہ بھی

طوالت کا احساس دامن گیر ہے، ورنہ مجنوںؔ صاحب کی شاعری پر قلم رکنے کا نام نہیں لیتا ہے۔ لہذا یہ چند اشعار ارباب ذوق نظر کے سامنے پیش کر کے اپنے مضمون کے لئے تمت بالخیر لکھتا ہوں ۔

کہہ دے گا زمانہ مری بربادی کا قصہ
مجھ سے تو یہ افسانہ بیاں ہو نہیں سکتا

☆

پتھر کو اٹھا لیتا ہوں میں جان کے ہیرا
دیوانگیٔ شوق کی روشن نظری ہے

☆

کوئی غم گسار جنوں ملے اسی جستجو میں پھرا کئے
نہ ملا وہ ایسا کوئی مجھے جو لکھے کو میرے مٹا سکے

☆

مٹا مٹا کے یہ دنیائے بے وفا مجنوںؔ
بنا رہی ہے وفاؤں کی یادگار مجھے

☆

اے آرزو ٹھہرو، اے حسرتو رک جاؤ
اب دل کے جنازے پر کچھ دیر تو میں رولوں

☆

کیوں برق کا گلہ کروں آتشِ گل کو بھول کر
پھونکا گیا تھا آشیاں، موسم بہار میں

مجنوںؔ صاحب نے مومنؔ وغالبؔ کو بہت پسند کیا ہے۔ مگر داغؔ کی سلاست و فصاحت اور ریاضؔ خیر آبادی کی خمریات کے رنگ کو اپنانے کی بھی حتی الامکان کوشش کی ہے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ انہیں اساتذۂ کرام کے مطالعہ کا اثر ہے کہ ان کے یہاں غزل کی تمام تر رنگینیاں اور پہلو داریاں اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہیں۔

مجنوںؔ کا کلام از اول تا آخر قابل مطالعہ ہے۔ میں ایسا دعویٰ تو نہیں کرتا اسقام و نقائص، فطرت انسانی ہیں۔ ''محسوسات مجنوں'' بھی اس سے مبرا نہیں۔ البتہ ایک شاعر جس نے روایت پسندی کو اختیار کیا ہو۔ جو اپنی قدامت پسندی پر نازاں ہو اس کے اشعار کو پرکھنے کے لئے، ہم جدید شاعری اور ترقی پسند ادب، کے معیار اور کسوٹی کو استعمال نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی کرتا ہے تو یہ ہرن پر گھانس لادنے کی کوشش ہے۔ ''محسوسات مجنوں'' کا مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ اختیار اس کے اختیار سے باہر ہو تو ہوا کرے اسے ایک مجبوری سمجھ کر اختیار کرنا ہوگا۔ کلاسیکی ادب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مجنوںؔ کی شاعری کلاسیک کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس نقطۂ نظر سے کلاسیکی ادب میں یہ ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

عدیم الفرصتی اور مضمون کی طوالت کی وجہ سے میں نے مجنوںؔ صاحب کی کئی رباعیات اور قطعات کا ان دیکھا کر دیا ہے۔ انشاءاللہ آئندہ فرصت ملی تو اس صنف کلام پر بھی اپنے تأثرات کا اظہار کروں گا۔

نیست ممکن کہ گریزم زغزالانِ خیال
ورنہ مجنوںؔ تو تنہا تر ازیں می بائیست

(پیش لفظ ''محسوسات مجنوںؔ''، مونگیری)

☆☆

پروفیسر ظفرؔ حبیب

کی

اگلی پیش کش

فنکارانِ بہار

(جلد دوم)

جلد منظرِ عام پر آرہا ہے

''میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو''

FANKARAN-E-BIHAR
(Vol. 1)
by : Prof. Zafar Habeeb

"ظفر حبیب صاحب" اردو ادب میں خاصا پہچانا نام بن چکا ہے۔ موصوف نے اپنا ادبی سفر شعر گوئی سے شروع کیا بعد میں افسانہ اور مضمون کی اصناف میں سیر حاصل لکھا۔ اب تبصرہ، تنقید اور تحقیق کے موضوع پر لکھ رہے ہیں۔

"ظفر حبیب صاحب" کی کتابوں کو ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور عوام الناس کی طرف سے بھی ان کی کتابوں کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

پروفیسر ظفر حبیب صاحب کے لئے میں اتنا ہی کہوں گا کہ "اللہ کرے کہ ہو زورِ قلم اور زیادہ"

وسیم احمد فہمی

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978- 93- 5073- 869- 6